51

اردو نظموں

کا

مطالعہ

ساحل احمد

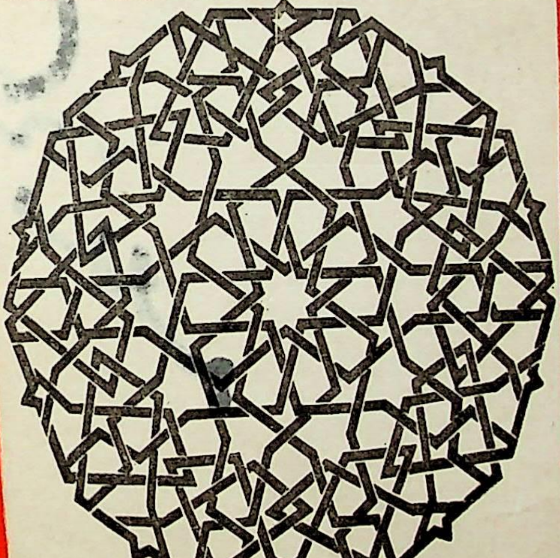

اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد

अ [illegible]

[illegible]

اردو نظموں کا مطالعہ

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

ساحل احمد

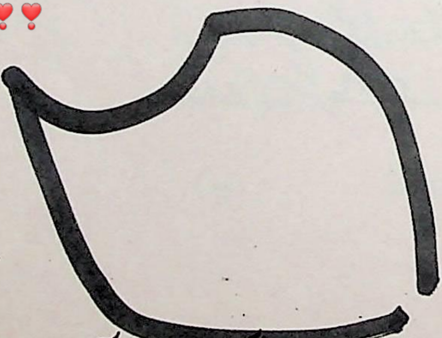

اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد۔ ۱۱

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے یاد میں

U.W.G ©

کتاب: اردو نظموں کا مطالعہ
تحریر: ساحل احمد
اشاعت: ۱۹۹۷ء
قیمت: ۲۵/-
تعداد: ۵۰۰
کتابت: ذکی احسن
طابع: تاج آفسٹ پریس۔ الہ آباد
ناشر: اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد
تقسیم کار: لٹریری بک سنٹر ۱۲۶ چک۔ الہ آباد

ترتیب

پیش لفظ : ۵
آدمی نامہ : ۷
مسدس مدّ و جزر اسلام : ١۴
شعاع امید : ٣٠
خاک ہند : ۴٠
کسان : ۴۷
نظموں کا متن : ۵۷
فرہنگ : ۷۴
تعارف : ٨۷
نظم کا سفر ١٠١

پیش لفظ

مدّتوں سے خیال تھا کہ نصابی سلسلے کی کتابیں شائع کی جائیں تاکہ طلباء کی درسی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ ابھی یہ خیال سطحِ ذہن پر ہی آیا تھا کہ میں 93-7-6 کو سڑک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ بد سے بدتر حالت ہو گئی۔ ۲½ سال تک مسلسل درد و اذیت کے حصار میں رہا ہوں۔ الٰہ آباد اور دہلی کے ہسپتالوں میں ۴ بڑے اور ۲ چھوٹے آپریشنوں کے پیچ و خم سے گزرا ہوں۔ سر، شانہ اور کولھے کی چوٹ بحال ہو گئی تھی مگر داہنا ہاتھ قابو میں نہیں آسکا ٹیڑھا سا ہو گیا۔ جون ۱۹۹۶ء سے تجدید اشاعت کا کام شروع کرنے کی سعی کی ہے۔ لکچر سیریز، مونو گراف اور لٹل بک سیریز کے اشاعتی سلسلے کے پروگرام تیار کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قیمت بھی واجبی رکھی گئی ہے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل نظموں میں سے سرِدست یہ پانچ نظمیں منتخب کی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ مفید ثابت ہوا تو اگلی اشاعت میں مزید نظمیں شامل کرنے کی سعی کروں گا۔ آپ کے مشوروں کا انتظار کروں گا۔

ساحل احمد

الٰہ آباد
۱۳ر جون ۱۹۹۷ء

آدمی نامہ

نظیرؔ ۱۰ ویں صدی کے وسط و اواخر اور ۱۹ ویں صدی کے اوائل کے شاعر تھے۔ دلّی میں پیدا ہوئے لڑکپن کے حدود میں داخل ہی ہوئے تھے کہ دلّی آفاتِ سماوی و زمینی کا شکار ہونا شروع ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کی فوجیں دلّی دروازے پر دستک دینے لگی تھیں۔ انقلاب کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ امراء و رؤسا حیران و پریشان تھے۔ عوام بے چین و مضطرب کسی فیصلے پر نہیں پہونچ پا رہی تھی۔ اعتماد و یقین کی زنجیریں ٹوٹنے لگی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جن میں نظیرؔ نے سنِ بلوغیت میں قدم رکھا تھا ۲۲، ۲۳ سال تک دلّی کی آب و ہوا میں سانس لی پھر ابدالیؔ کے حملوں کے بعد دلّی میں قیام مناسب نہیں جانا [illegible] حقیقی اکبرآباد کو مراجعت کی وہیں شادی کی

اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ زندگی کی وسعتوں کا مشاہدہ کیا۔ اجتماعی فکر و احساس کی اہمیت جانی ۔ تنہا اپنی ذات میں ایک دبستان، ایک انجمن، ایک مملکت فکر کے بادشاہ تھے ۔

ان کی شاعری کا جسم اور روح دونوں ہندیائی فکر کا حصّہ رہے ہیں۔ اسی لئے ان کی نظموں میں ہندوستانی رنگ کی خوشبو اور چمک دمک ملتی ہے۔ اسی چمک دمک میں صبح و شام کی خنک آہٹیں پھل پھول، چرند پرند۔ اٹھکھیلیاں کرتی ہوائیں عوامی مسائل، میلہ و بازار۔ تیوہار۔ رنگ بھرا موسم۔ رسم و رواج اور طرح طرح کی کیفیات مجسم ہوگئی ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی مروجہ روایات سے انحراف کیا اور اپنی شاعری کا خمیر اسی مٹی سے اٹھایا۔ اور اسی مٹی کی آبرو کو اپنی شاعری کا اصل جوہر قرار دیا۔

"آدمی نامہ" اسی جوہر سے وابستہ وہ احساس خودی ہے جو نظیر کی شعری فکر کا ہی اٹوٹ حصہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے ہندیائی کلچر کو نمو رنگ رکھنے یا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی انسان دوستی نے انھیں عوام میں مقبول بنا دیا۔ وہ عوامی زندگی کے بہترین نمائندہ شاعر تھے۔ آدمی نامہ ہندوستان کی سرحد سے آگے بڑھ جانے والی وہ نظم ہے جو ادھورے آدمی کی نہیں بلکہ اس پورے آدمی کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ پورا آدمی گورکی کا بھی آدمی ہے اور کیٹس کا بھی، موپاساں کا بھی اور شلر کا بھی، تلسی داس کا بھی اور فردوسی کا بھی۔ یہ نظم آفاق کی لامحدود وسعتوں کو چھو لینے والی نظم ہے۔

نظیر نے آدمی اور اس کی آدمیت کو ترازو کیا ہے۔ اسے ہر گوشۂ حیات

میں تلاش کیا ہے۔ اسے ہر چھوٹی بڑی محفلوں میں، چوپالوں میں بیٹھکوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ کچّی پکّی دیواروں میں سانس لیتی زندگیوں کے بیچ اس آدمی کو تلاش کیا۔ جو واقعی آدمی ہو۔ آدمی کہنا اسے زیب دیتا ہو۔ آدمی کا آدمی کی طرح جینا اور دوسروں کو بھی جینے دینا ہی آدمی کی آدمیت ہے۔ آدمیت مرجائے تو آدمی بھی مرجاتا ہے۔ اس کا چلنا پھرنا اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ زندہ ہے۔ زندگی صرف چلنے پھرنے کا یا سانس لینے کا نام نہیں۔ آدمی کو ساتھ لے کر چلنے کا نام زندگی ہے زندگی وہ زندگی جو آدمی کو زیب دے سکے۔

آدمی نامہ میں نظیر نے آدمی کو کسی محدود دائرے میں رکھ کر نہیں دیکھا۔ وہ آدمی کو کھلی فضا میں سانس لیتے اور ہنستے بولتے دیکھتا ہے۔ روتا بسورتا آدمی نظیر کے لئے پسندیدہ نہیں۔ کاہلی کا لباس پہنے آدمی کی بدحالی انھیں مضطرب نہیں کرتی۔ ایسا آدمی زمیں پر بوجھ ہے۔ مکر و دغا کی سوئیوں سے سلے لباس میں آدمیت کب باقی رہ پائی ہے۔ حالات سے نبرد آزما ہوتے کا نام آدمی ہے۔ ان کا آدمی نہ تو یک رخا ہے اور نہ ساکت سپاٹ۔ ان کا آدمی رنگوں کا شیدائی بھی ہے اور مخالف بھی۔ وہ حالات میں سمٹے سمٹائے آدمی کو جگانے کی سعی کرتے ہیں اور کہیں اپنے ظریفانہ طور و طریق سے تساہلی یا بے حسی کے پرخچے اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے آدمی کے توسط سے ہی سماجی رشتے اور انفرادی و اجتماعی اخلاق و خصائل، مشاغل حیات اور معمولات کی تصویریں بنائی ہیں۔ یہ تصویریں بے رنگ بھی ہیں۔ اور رنگین بھی۔ بد وضع بھی اور خوبصورت بھی۔ مگر کہیں بھی سچائی کو بولنے سے نہیں روکا۔ ان کی سچائی زندگی کی وہ سچائی ہے جو آدمی اوڑھتا بھی ہے اور

نچھاتا بھی ہے۔ اسے بے پردگی سے عار نہیں۔ اُسے کسی بھی تضحیک کے پہلوؤں سے شکوہ نہیں۔ وہ خود اپنا محتسب ہے۔ کرائے کا محتسب نہیں۔ یہ آدمی جو نظیر کا آدمی ہے۔ اپنا ہی حساب کرنے پر یقین رکھتا ہے۔

اس نظم میں سولہ بند ہیں۔ ہیئت مُخمّس کی ہے۔ "ہے سو ہے وہ بھی آدمی" پانچویں مصرعہ کا وہ مردّف حصہ ہے جس کی نسبت الف قافیہ سے ہے۔ چبا، ملا، چکا، نما، تا، بھرا، چڑھا، پڑا، رہا، لگا، گڑھا، گیا، بُرا میں "ا" حرف روی ہے لیکن حرف دخیل اور حرف تاسیس مختلف ہیں۔ نظیر نے "ا" کو قافیہ کی اساس قرار دیتے ہوئے قافیے وضع کیے ہیں اور اس طویل ردیف سے ایک خصوصی آہنگ کی اختراع کی ہے جس سے نظم شروع تا آخر ایک خاص طرز کی سماعی کیفیت پیدا کر سکی ہے اور کبھی کبھی یہ (حرف روی) اپنے پس اور پیش (پساوند اور پیشاوند) کے حرفوں کو بھی تابع بناتے ہوئے متحرک یا سکونی کر لیا ہے جیسے رہا، چکا، پڑا وغیرہ کے ساتھ دوڑتا، تاڑتا، رہنما، دیکھتا، بدنما کا قافیہ۔

نظم کے پہلے بند کا ہر مصرعہ مردف ہے۔ بادشہ، گدا، نوا، چبا، کھا نے تکرارِ معنی کی فضا ہی نہیں پیدا کی مخمس کی ہیئت کو بھی وضوح کر دیا ہے۔

نظیر نے اپنی پوری نظم میں آدمی کو کئی حیثیتوں سے متشکل کیا ہے۔ ان کا یہ موضوع ارتکاز آدمی کو آئیڈیلائز کر دیتا ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی ظہوری صفات حاصل کر لیتا ہے۔ آدمی کو بادشاہ، مفلس، گدا، زردار، بے نوا، ابدال، قطب، غوث، ولی، منکر، نار، نور، شیطان، ہادی، امام، خطیب، نمازی، چور، عاشق، قاتل، فتنہ، وکیل، صیّد، قاضی، کہار، مداری، تاجر، گاہک، رقّاص، امیر، فقیر، شریف، کمین، پیر، مرید، نیک، بد کہہ کر ان کے مقام اور مرتبہ، فعل و اعمال اور مزاج و اطوار کا تعین کیا ہے۔

آدمی، آدمی ہے لیکن اپنے متضاد تشخص کے باعث الگ الگ حیثیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی وہ منصبی اعمالیہ اور اطوار یہ تضاد ہے جس نے آدمی کو نفرت یا محبت سکھلائی ہے۔ آدمی کا خمیر نہ اکیلا محبتوں کا ہے اور نہ نفرت کا۔ اگر نفرت آدمی کو اس کے منصب سے ہٹا دیتی ہے تو محبت اس کا منصب بڑھا دیتی ہے۔

نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور — اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں — اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں

نظیر نے آدمی کی جو پینٹنگس تیار کی ہیں ایک دوسرے سے اتنی زیادہ مختلف ہیں کسے آدمی کی اصل کہا جائے اور کسے آدمی کی نقل کہا جائے۔ بہ شکل صورت تو ہر آدمی ایک ہی ہے لیکن مزاج و اطوار انھیں یک شکل یا یک رنگ نہیں رہنے دیتا۔ نظیر کا مشاہدہ بہت گہرا اور سچا تھا۔ اسی لیے ان کی کوئی پینٹنگ ادھوری نہیں، مکمل ہے۔ وہ آج بھی پرانی نہیں۔ شیطان ہو یا ہادی، نظیر نے سب کو آدمی ہی کہا ہے۔ یہی غلط ہے۔ بہ ظاہر شکلاً وہ آدمی ہے مگر مزاجاً شیطان ہے۔ چور، مفسد، کمین، زانی اور قاتل کو آدمی کہنا اور شاہ، متقی، نمازی، حلیم، مصلح کو بھی آدمی کہنا مناسب نہیں۔ آدمیت سے دور شیطنت سے نزدیک آدمی کو، آدمی کا لقب زیب نہیں دیتا۔ یہ تو یہ "سب برابر ہیں" کا روز مرہ اور ہی زیادہ خطرناک ہے۔ نخوتی یا ہیکڑی یافتہ مخلوق زمیں پر کیا کیا فتنہ بوتی ہے اور شرافت، ذلت و رسوائی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے بوڑھی ہوتی جاتی ہے مگر بد یہ خصلتوں پر لگام دینے والا کوئی نہیں۔ ہے بھی تو اس کی زبان تراش دینے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ ظالم کو روکو، نہ روک سکو تو زباں سے کہو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے بُرا کہو۔

نظیر بہت سادہ لوح تھے، انھوں نے بدی و نیکی کے خصائل اور صورتوں کی نشاندہی تو کر دی مگر شیطنت تو آدمی کی ہی شکل میں زندہ رہی۔ کب مری یا ماری گئی یہ وہ آدمی جو کبھی فرعون یا نمرود یا بوجہل یا چنگیز یا یزید یا رشدی کے نام سے جانا جاتا ہے یا فعل بدّ یہ سے پہچانا جاتا ہے۔

شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا

پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی

دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثلِ رانگ ہے

غیبت و بطل، ظلم و بیداد اور بغض و عناد کا رسیا یہ آدمی اپنے فعل بدّ یہ سے زمین کی رونق، امن و سکون اور پیار و دوستی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ نئے حاکمین و شیاطین کی یہی منشاء ہے کہ شیطانی سرشت جلا پا سکے اور آدمیت کی خوشبو ماند پڑ جائے۔

حیران ہوں، یارو، دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے
اور آدمی ہی چور ہے اور آپ ہی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے
دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثلِ رانگ ہے

اور آدمی پہ تیغ سے مارے ہے آدمی

سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار

آدمی اپنی الگ الگ حرکات و معاملات کی بنا پر اچھی بری شبیہہ بنانے پر یقین رکھتا ہے۔ آدمی کا یہی یقین اس کے خاکی ہونے کا ثبوت ہے۔ وہ ازل سے نیکی و بدی کی سرشت لے کر پیدا ہوا۔ اس کی حیات یا زندگی ازل سے ابد تک کا ایک سفر ہے۔ مادّی اور غیر مادّی رشتہ کا یہ وہ شاہکار ازل ہے، جس کے پاس ہر ایسی طاقت ہے جو اسے بڑے سے بڑا منصب دلا سکتی ہے۔

" آدمی نامہ " ایک ایسی نظم ہے جس سے انسانی خد و خال کی پوری تصویر بغیر کسی پردہ پوشی کے ظاہر ہو جاتی ہے اور اس عملِ ظاہریہ سے مقصدیت کو نئی طاقت ملی۔ اور حیات جبریہ کی منفی روش پائداری نہیں حاصل کر سکی۔ نظیر کی اس کامیابی میں اسلوب فکریہ کے علاوہ مخمس کی ہیئت بھی معاون ثابت ہوئی ہے اس ہیئت میں شعری بہاؤ بہت سبک نرم اور حلیم بن جاتا ہے۔ نتیجہ میں مادّی یا غیر مادّی ہر فکر کی غنائی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ نظم آدمی نامہ مشاہدہ اور تجربہ کے مشترک احساس کا نام ہے۔ نظیر نے اس نظم سے آدمی کو خود احتسابی کا درس دیا ہے۔ طنز و مزاح کی کاٹ بھی اتنی گہری ہے کہ آدمی یا بہروپیے کا دوغلہ پن چھپ نہیں پاتا۔ ایک ایک بند، ایک ایک جزو نکلتا ہی چلا جاتا ہے۔ احساس خفیہ کی ان تہوں کا کھلنا اس نظم کی خوبی اور نظیر کی کامیابی ہے۔

مسدس مدّ و جزرِ اسلام

حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں بہ مقام پانی پت (کرنال) حال ہریانہ ہوئی۔ پانی پت کو کئی جنگی انقلاب کا تجربہ تھا پانی پت کی آب و ہوا ان کی ذہنی پرورش میں کبھی معاون رہی ہے۔ ملک کی سیاسی، معاشرتی اور ذہنی انقلاب کا اثر نہ صرف ان پر بلکہ ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ ۱۸۵۰ء کا ہنگامہ انقلاب کی ناکامی کے جو دور اثرات مشرقی قدر و تہذیب پر پڑے انھیں زندہ باش شعراء کے کلام میں نمو رنگ ہوتے دیکھا جا سکتا ہے۔ حالی کی شاعری کے سابقہ حصوں سے لے کر لاحقے تک اسی رنگ کی حقیقتیں موجود ہیں جو ہمارے اذہان کو بھی متاثر کرتی ہیں اور اس دردمند دل سے اٹھتی آہ اور سلگتے احساس کی دو دیائی لہر دیکھی جا سکتی ہے آخری تاجدار کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کریں جس کو حسرت موہانی نے "غیرت د

حسرت کا مرقع کہا ہے۔

جہاں ویرانہ ہے پہلے بھی کبھی آباد گھریاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشریاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن ہے اور شجریاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب کبھی رُلتے گہریاں تھے

جہاں سنسان جنگل ہے جہاں شہر خموشاں ہے
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شریاں تھے

جہاں اب خاک پر ہیں نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشہ دیدۂ اہل نظر یاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ انقلاب کی گرد تہہِ خاک نہیں ہو پائی تھی۔ آنسوؤں کی مہک مٹ نہیں پائی تھی۔ قدر و تہذیب کا لہو رنگ احساس ماند نہیں پڑا تھا لیکن ہوا کی سمت بہہ جانے والے شعراء نے دامن ماضی پر پڑی گرد احساس جھاڑ دی تھی۔ اور ہوا کے ساتھ بہہ نکلے تھے محترم جلیل قدوائی نے سچ کہا ہے۔

"اردو کے شعراء الفاظ کی بازی گری میں محو تھے اور پست جذبات سے کھیلتے تھے۔ سانپ نکل گیا تھا مگر اب تک لکیر پیٹ

رہے تھے۔ درحقیقت اس دور کی اردو شاعری ہمارے قومی ادب کے صفحہ پر ایسا بدنما داغ ہے جو اب تک باوصف کوششِ بسیار مٹائے نہیں مٹ سکا۔"

ڈاکٹر سید عابد حسین نے اس دور کی ادبی و شعری روایات کا یوں نقشہ کھینچا ہے۔

"ادیب اور شاعر جن کا کام زندگی کی ترجمانی اور حقیقت کی تفسیر ہے زندگی کی سختیوں سے ڈر کر حقیقت کی تلخیوں سے گھبرا کر اپنے اپنے خیالی قلعوں میں محصور ہو گئے تھے۔ غم روزگار کا اندیشہ دل سے مٹانے کے لیے کوئی رندوں کی صحبت میں عشرت پرستی کی داد دے رہا تھا کوئی کنج عزلت میں خود پرستی کے مزے لے رہا تھا۔ خدا کی کائنات، بندگان خدا کی دنیا، مظاہر فطرت، مسائل حیات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خودی کے عالم میں محو تھے اور اسی کو خدائی سمجھتے تھے۔ اپنے دلوں میں جو حقیقی سوز سے خالی تھے جلی ہوئی راکھ کو کریدتے تھے اور بجھی ہوئی چنگاریوں کو پھونک پھونک کر دہکاتے تھے۔ شورش تخئیل کا نام حسن رکھا تھا۔ اضطراب قلب کو عشق قرار دیا تھا۔ اسی بازار حسن کا اسی ناکام عشق کو خلاصہ کائنات اور سرمایۂ زندگی جانتے تھے۔ ایک طرف داستان گو جن و پری کی کہانیاں سنا کر اونگھتوں کو سلاتے تھے۔ رنگین مزاج سخنور ریختی کی غزل اور ریختے کی واسوخت سے بوالہوسی کی ہوائے نفس کو بھڑکاتے تھے۔ دوسری طرف کچھ دل جلے شاعر دنیا کی بے ثباتی، انسان کی بے بسی سعی و عمل کی بے اثری،

تقدیر کا ستم، فلک کے جور کا دکھڑا روتے تھے اور حیات بے بقا سے دلوں کو پھیر کر فنا کی راہ دکھاتے تھے۔ گہرے جذبات اور اونچے خیالات کی کمی سے سیدھی بات میں لطف نہیں آتا تھا۔ اس لیے بے قید مبالغے، پیچیدہ ترکیبوں، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے تھے اور اسے ہی آفرینی اور بلند پردازی کہتے تھے۔"

محترم عابد صاحب کے یہ خیالات آج کے ۸۰٪ فیصد ادب وشعر پر صادق ہیں۔ فحاشی، رنگینی، عریانی اور چہل سازی کی شاعری کو واہ واہ کے جملوں سے سرفرازی عطا کی جاتی ہے۔ ہاتھ نچانے اور کمر لچکانے کی غبارہ صفتیں جمال فروشی اور نخرئی رنگوں سے مال و متاع سمیٹنے کی ادائیں۔ اظہر المنشمس ہیں۔ گھٹیا فکر کو سراہنے کی روش خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ خوشامد اور چاپلوسی نے شاعری اور شعریت، ادب اور ادبیت کو لہو رنگ کرنے کی کون سی کسر چھوڑی ہے۔ دیانت و راستی کو ہر محاذ پر زک دینے کی ابلیسی سرشت اختیار کی گئی ہے۔ انعامات و اعزازات کے حصول میں ایک لمبی لائن دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ موقع شناسی سچے بہی خواہان کو الگ تھلگ کر دینے کی سازش رچتی رہی ہے۔ حالی، اقبال، شبلی، اکبر کا دور آج کے تقابل میں بہت بہتر تھا بدّیہ قوتیں سر اٹھا رہی تھیں مگر جسامت نہیں پا سکی تھیں۔ مگر اب آج وہی بدّیہ قوتیں بھرپوری جسامت اختیار کر گئی ہیں۔ زبان وادب اور مذہب سے بے گانگی اپنی شرّیت کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ دانشوری تماشہ دیکھ رہی ہے۔ شیطنت ادب کی مملکت میں در آئی ہے۔ اخلاق و راستی اور محبت کے روزن و در پر سوداگری نے خود غرضی اور خود پرستی کی کیلیں جڑ دی ہیں۔

جن بزرگوں نے ادب و اخلاق کی شمعیں روشن کی تھیں حالِ موجودہ میں
وہ بجھ گئی ہیں یا آخری لَو دے رہی ہیں۔

حالی اسی دورِ سابقہ کی یادگار ہیں جنھوں نے حالات کا مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ بدتر فکر کو بہتر فکر میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کوشش کل بھی لائق توجہ تھی اور آج بھی ہے۔ انھوں نے مغربی افکار و ادب سے استفادہ تو کیا مگر اسے مشرقی قدر پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ کرنل ہالرائڈ کی ایما پر محمد حسین آزاد کی نظمیہ محفل میں حالی نے مناظرۂ رحم و انصاف، حبِ وطن ـــ برکھارت، اور نشاطِ امید پڑھی تھیں۔ مسدس مد و جزرِ اسلام ۱۸۷۹ء میں سرسید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی تھی۔ سرسید کی علمی تحریک نے ادبی تحریک کو بھی پر و بال بخشا۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی مد و جزر پر بھی نظر ڈالی۔ علمی کم مائیگی کو دور کرنے کی خاطر ملک بھر کے علماء و ادباء کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ سرسید اور ان کی تحریک نے حالی کو نئی فکر اور نئی سوچ عطا کی۔ سرسید کی دردمند آواز کو حالی نے محسوس کیا۔ محسن الملک، وقار الملک، شبلی، نذیر احمد اور چراغ علی، سرسید کے وہ قابل قدر رفقاء تھے جن کی علمی، مذہبی اور ادبی خدمات کو تسلیم نہ کرنے کی قوم (مردہ دل بھی) جرأت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ حالی، سرسید کے سچے پرستار تھے وہ پہلے پیامی ہیں جنھوں نے سرسید کے خیالات و بیانات کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں لاہور کے لفظوں میں:

"حالی سرسید کی بانسری تھے جو پیام سرسید نے اپنی زبان سے نثر میں سُنایا اسے شاعری کی زبان اور نغمے کی لے کے ساتھ حالی نے نظم کی۔"

زمانہ سرسید کی تصویر جلیل احمد قدوائی نے اس طور کھینچی ہے :

> " مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلی تھیں۔ ان کے عادات و اخلاق بگڑے ہوئے تھے۔ کاہلی، سستی، فضول خرچی اور بد مذاقی ان کی رگ رگ میں سرایت کر کے اس طرح رہ گئی تھی جیسے نشہ کے بعد جان لیوا اور تکلیف دہ خمار مذہب کی جگہ باطل اوہام پرستی نے لے لی تھی۔ "

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی فکری و ذہنی پسماندگی کو دور کرنے اور انہیں باعزت زندگی دینے کی خاطر علیگڈھ کالج قائم کیا۔ ان عیوب کو ختم کرنے، حوصلہ بڑھانے اور کچھ کر گزرنے کی وہ تمام کوششیں کیں جو آہستہ آہستہ ثمر بار ہوتی دکھائی دینے لگیں اور اس ثمر بار فکر کے حصول کے لیئے اپنی تمام ذہنی، مالی اور جسمانی قوتیں اس رہِ راستی میں صرف کر دیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سائنٹفک سوسائٹی تہذیب الاخلاق اور علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، خطبات احمدیہ، آثار الصنادید، تاریخ سرکشی بجنور اور اسباب بغاوت ہند وغیرہ ان کی کاوشوں کا بہترین ثمرہ ہیں۔ اور ان سب کی مجموعی شکل و شبیہہ کا نام مسلم یونیورسٹی ہے۔

سرسید کی تحریک ابتداً تعلیمی رہی ہے لیکن تقاضۂ وقت نے اسے ادبی، معاشی اور معاشرتی شکل عطا کر دی۔ حالی نے سرسید کے افکار و خیالات کو نظمیاتی پیکر دیا۔ اور خیالات سرسیدی گھر گھر پہنچایا۔

حالی کا یہ بیان " مدوجزر اسلام " کا محرک بھی ہے اور سرسید کی خدمات کا اعتراف نامہ بھی۔

" ..... قوم کے ایک سچّے خیر خواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت

دلائی، نہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ (اچھا) کام نہ لینا پڑے شرم (غیرت) کی بات ہے۔۔۔۔

... عزیز ذلیل ہو گئے شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس گھر گھر پکار رہا ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دوہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے۔۔۔۔۔

ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھ چکے ہیں مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کو بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔"

سرسید کے اس عالمانہ تفکر نے کہاں کہاں حوصلوں کے چراغ روشن نہیں کیے۔ ہاں کچھ بدبختانہ روش نے ان چراغوں کو بجھا دینے کی بھی کوشش کی۔ لیکن نیک اور راست گزاروں نے ان چراغوں کو دامانِ احساس میں چھپا کر روشنی زندہ رکھی ہے جسے بدخواہی کی ہوا ابھی بجھا نہیں پائی۔

جب حوصلے میں قوت ادراک کے ساتھ ایمانی حرارت منجذب ہو جائے تو روشنی کبھی نہیں مر سکتی۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ اسی عزم و ارادے کی روشنی کا ایک نام مسدس حالی ہے۔ حالی نے خود مسدس کے مقدمہ میں سرسید کی ملاقات، ان کے اثرات اور اپنی شاعری کے بدلتے تیور کے لیے سرسید کے رہینِ منت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح سرسید بھی مسدس کی خوبی اور ادبی خدمات کا کارنامہ سمجھتے تھے۔ ان کے ایک خط کا مشہور جملہ ہے

> "جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا، میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔"

(خطوط سر سید - مرتبہ سر سید راس مسعود نظامی پریس بدایوں)

مسدس، حالی کی ذہنی پختگی اور اعلیٰ روشنی کی مثال ہے۔ یہ مثال سر سید کی ادبی تحریک کا وہ نادر و نایاب ثمرہ ہے جسے وقت کی گرد کبھی میلا نہ کر پائے گی۔ یہ صرف ایک نظم ہی نہیں بلکہ ہماری قومی و تہذیبی زندگی کا ثمربار آئینہ بھی ہے۔ اس نظم سے حالی کے دردمند دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ وہ آواز ہے جس نے اردو شاعری کو تب و تاب، ولولہ، کشادگی اور تاریخی شعور عطا کیا۔ حالی نے اس نظم کے توسط سے اس قوم کی بدحالی اور کمزوری کو موثر اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم حالی کی نیک نیتی، حلیمی، دل سوزی کا ایسا آئیناتی اشاریہ ہے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ اور عملی تحریک کا ذریعہ بھی۔ آل احمد سرور کا خیال سو فیصد درست

> "مسدس تو ایک عہد آفریں کارنامہ ہے جس میں ایپک کی وسعتِ خیال، عروج و زوال کی مرصع تصویریں اور اخلاق و تہذیب کی شعریت کے معجزے ہیں۔ مسدس سے نظم کو اردو شاعری میں اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے شاعری کنائے سے صراحت، اشارے سے تفصیل اور انتشار سے وحدتِ تاثر اور تنظیم کی طرف مائل ہوتی ہے۔"

(ادب اور نظریہ ص ۲۴۱)

مسدس وہ مسلسل اور بیانیہ نظم ہے جس میں شعر کی وہ تمام ظاہری و باطنی اصالت

موجود ہے جو کسی بھی شعر کو یا نظم کو مکمل کرتی ہے۔ نظم کا اسلوب بہت سادہ اور سلیس ہے۔ غلو یا فنی تکلّم کا کہیں بھی شائبہ نہیں۔ ان کا قلم سچائی کو شعری بہاؤ کے ساتھ شروع سے آخر تک لے گیا۔ یہ مسلمانوں کے کھوئے ہوئے جلال اور مٹتی ہوئی مرتبت توقیر کا ہو رنگ تاریخی زائچہ ہے۔ بلکہ قوم کے زوال کا مرثیہ بھی ہے۔ حالی نے چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور ان تمام محرکات کی نشاندہی کی جس کے باعث قوم پُرجلال اور پُر توقیر تھی اور پھر کیوں، کیسے اور کس طرح ذلیل و رسوا ہو گئی اور کس طرح بہی خواہانِ قوم نے اپنی ہی قوم کی غیرت و عزت، حکومت اور دولت غیروں کو منتقل کر دی۔ مسلمانوں کا وہ دقیع کارنامہ خواہ ادبی رہا ہو یا سائنسی اسے مٹانے یا دریا بُرد کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ ان تمام تہذیبی علائم پر سیاہی پھیر دینے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کو پھر اسی صحرا نوردی پر مجبور کر دیا۔ جہاں سے وہ برسرِ اقتدار آئے تھے اور دنیا پر اپنی حاکمیت، جلالیت اور اکبریت کا پرچم لہرایا تھا۔ حالی نے ماضی کے ان گم شدہ چہروں کو پھر نیا چہرہ دینے کی سعی کی اور مسلمانوں کو بے حسی، مفلسی، کم مائیگی اور مایوسی کے دھاگوں سے بُنی چادر اوڑھنے یا عیاری، سوداگری اور جاہلی کے دھاگوں اور سوئیوں سے سلے لباس کو اتار پھینکنے کی تلقین کی۔ سادہ لباسی اور نیک روشنی کا لباس اختیار کرنے پر زور دیا۔ اپنی علمی، تہذیبی اور ذہنی وراثت کی حفاظت کرنے اور اُسے اپنی متاعِ عزیز قرار دینے پر زور دیا۔

> "اسلام کے عروج و زوال کے بیان سے مقصد رونا رُلانا نہیں بلکہ مولوی عبدالحق صاحب کے الفاظ میں اس بگڑے ہوئے گھر کو پھر بنانا اور اس خرابی کو از سرِ نو تعمیر کرنا ہے"۔

(مقالاتِ عبدالحق، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد)

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

> "مسدس میں قوم کی غیرت رگ و حرکت میں لانے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے قومی تاریخ کے پُرفخر کارناموں کو شاید سب سے پہلی دفعہ اس طرز و اسلوب سے اس ملک میں بیان کیا گیا تھا۔ رونے کی تسکین کے ساتھ اس کتاب میں مسلمانوں کے فخر و غرور کا سامان بھی تھا۔"

حالی کو مسلمانوں کی موجودہ پستی و بدحالی کا شدید احساس تھا اور مسلمانوں کے مقدر کا ستارہ ماند پڑ چکا تھا۔ اور پھر اس موجودہ دور میں اس کا دوبارہ چمکنا ممکن نہیں تھا۔ پوری قوم کی تقدیر معدومیت کے حصار میں گھر چکی تھی اس سے نجات پا لینا یا فلاح کی کوئی صورت وضع کر لینا مشکل تھا۔ حالی کا احساس معدومیت اور سرسید کے عملِ حرکیہ اس مسدس کے لکھنے کا موجب ہوئی۔ مسدس کی ابتدا ہی میں حالی کا لہجہ بہت کڑوا اور کسیلا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے سترہ سو سالہ تاریخ تھی۔ نشیب و فراز تھے۔ عروج و زوال تھے۔ پستی و بلندی تھی۔ نہ وہ آنکھیں پھیر سکتے تھے نہ انھیں دیکھنے سُننے کی تاب تھی۔ اس تاب و ناتاب کے درمیان انھوں نے جو ایمانی فیصلے کیے ان فیصلوں میں سے ایک فیصلے کا نام مسدس ہے۔

اس فیصلے کو مثبت رویہ قرار دیتے ہوئے رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ

> "یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگِ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک تارا ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔"

مسدس میں شروع تا آخر قومی شعور کی علامات موجود ہیں۔ اسلام کی برتری و بلندی کے اسباب و علائم کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور مسلمانوں کی سستی و بدحالی کا نوحہ بھی پڑھتے ہیں۔ ہر مصرعہ سے ان حصول، کی آواز ابھرتی ہے ہر آواز مسلمانوں کو وحدت کے حصول کا درس دیتی ہے۔ حالی نے دیباچہ میں لکھا ہے۔

" اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی ابتر حالت کا نقشہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھا اور پھر مسلمانوں کا دینی اور دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے اس کے بعد اس کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے ان بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے کیا ہو گئے۔ "

ڈاکٹر بیلی کا قول ہے کہ

" مسدس اردو میں پچھلے سو سال کی بہترین مسلسل اور بیانیہ نظم ہے۔ "

، (اردو لٹریچر (انگریزی) کلکتہ)

مسدس کی ابتدا نعت پاک سے ہوتی ہے اور خاتمہ اسلام کی نئی پود سے توقعات پر ہوتی ہے۔ درمیانی حصہ میں پیام حق ہے، 'اسلام' قرون اولیٰ کے مسلمان تعمیر بلاد علم و حکمت، شاعر اور شاعری بغیچۂ اسلام کے ویرانی کے اسباب عرب و ہند کی شاعری کے اصول و مقاصد، شریفوں کی اولاد وغیرہ رابطے کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات فکری کے بیان میں حالی نے معتدل رویہ اختیار کیا ہے۔ نہ کہیں لغزش بیان ہے

نہ زعمِ بیان ہے۔ نہ کہیں غلو ہے نہ کہیں پردہ ہے۔ جو کچھ ہے وہ عیاں پر فشاں ہے یہ امرِ حیرت ہے کہ ایسی مشکل اور گنجلک زمین پر فکرِ شعر کی کیسی کیسی عمدہ عمدہ گل پاشی کی ہے درد، اثر، روانی و ترنم اور تسلسل و شگفتگی کس طرح پیدا کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ حالیؔ کا دکھا دل ایسے اہم موضوعات کو گویائی بخشتی ہے جسے ان کے پہلے تک گونگا بنائے رکھا تھا۔ حرکات و عمل بے عملی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔ اور جسے حالیؔ نے جگایا اور، جگا کر عمل حرکیہ پر زندگی کا نور عطا کیا۔ یہ ان کا کوئی چھوٹا یا معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ عظیم کام تھا جو ایک سچا مصلح کر سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ حالیؔ ایک سچے مصلح تھے حالیؔ ہی کیا اس دور عزمیہ میں سر سیدؔ، شبلیؔ، سید سلیمان ندوی مولوی، چراغ علی، محمد علیؔ اور پھر اقبالؔ، اکبرؔ کتنے محسن الملک، ڈاکٹر انصاری، حسرتؔ موہانی ایسے ہی اکابرین تھے۔

اس مسدس کے بعض بند یا اشعار بے حد دردیلے ہیں۔ انھیں پڑھنا یا ان کا تاثر قبول نہ کرنا ممکن نہیں۔ خصوصاً زوالِ بغداد اور تعمیرِ بلاد کے بند میں درد کی مہک موجود ہے۔ ان شعروں میں محاکاتی عمل بہت دور رس نتائج پیدا کرتا ہے

نصیب ان کا اشبیلیہ ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جسکی جل کر

ولادت اور نعت سرور کائنات کا حصہ سادگی واثریت کی مثال ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اس کے علاوہ یہ اشعار جوش، اصلیت اور راستی کی مثال بھی ہیں۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا قولِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری دنیا ہلا دی

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی
پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

مسدس اپنی فکریاتی لب ولہجہ اور صوتی اسلوب کے باعث ایک نادر و کمیاب شہ پارہ ہے۔ آنحضرت کی ذات بابرکات کے ذکر سے شروع ہو کر اسلام کی تعلیمات، عروج و ہیبت، اللہ کی وحدانیت کا یہ اعتراف نامہ ہے۔ حالی نے انتہائی خلوص و نیک نیتی سے ایک پوری تاریخ نظم کر دی ہے۔ اس پوری نظم میں سوز بھی ہے اور حقیقت بھی۔ اسلوب بہت ہی سادہ، سہل اور سلیس ہے۔ انھوں نے جو بھی تصویر دیکھی، اسے محسوس کیا اور بغیر کسی صراحت و پیچیدگی کے ہو بہو اسی طرح بیان کر دیا۔ مختلف طبقات معاشرہ کا بھی ذکر بغیر کسی تخصیص و تامّل کے کیا ہے۔ شرفائی اولادوں کی موجودہ روش پر قدغن لگانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لیئے نوجوانوں میں خود اعتمادی اور خودداری کو ضروری قرار دیا ہے۔ علماء کی تقلیدی اور اختلافی روش و وسوسے پر سخت تنقید کی ہے یہی وہ سبب ہیں جن کے باعث پوری قوم جمود و تعطل کا نمونہ بن گئی ہے۔ افراد و قوم میں نہ جینے کی للک ہے۔ نہ عمل حرکیہ کوئی علامت۔

اگر ہے مشائخ سے ان کو عقیدت
تو ہے پیرزادوں پہ وقف انکی دولت

کتاب اور سنّت کا ہے نام باقی
خدا اور نبیؐ ہے نہیں کام باقی

جنھوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت
نہ جانی مسلّط ہوئی اُن پہ ذلّت
رہے خاندانی نہ عزّت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

مسدس پر اختلافی خطوط اور مضامین بھی شائع ہوئے۔ رسمی اور تقلیدی شاعری کے اجارہ داروں نے اور خود اسی قبیل کے شاعروں نے اختلافی خطوط، ہجویہ نظمیں لکھیں۔ ملک کے طول و عرض کے اخباروں و رسائل میں اختلافی ہی نہیں مغلّظات سے بھرے مضامین بھی شائع ہوئے۔ مسدس اور حالی کے خلاف وہ طوفان بدتمیزی برپا ہوا اور جس جس طریقہ سے ان کی علمی شخصیت پر تہمت و بہتان کی کیچڑ اچھالی وہ بہت افسوس ناک ہے۔ تفصیلات میں نہ جا کر جلیل قدوائی کا یہ بیان اختصار سے نقل کرتا ہوں۔

> " شاعر (حالی) کو طرح طرح سے رسوا و ذلیل کیا گیا۔ غرض کہ اہلِ ملک کی بد مذاقی جس حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی پوری پوری نمائش ہوئی مگر جس طرح صداقت ہر باطل چیز پر غالب آتی ہے اسی طرح مسدس ان تمام اختلافات کا نشانہ بن کر بھی نہ صرف مقبول ہو کے رہا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری، ترقی اور رہ نمائی میں مسدس نے وہی کام کیا جو سرسید کی تقریروں نے کیا تھا، بلکہ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کی کوششوں کی کامیابی کا سہرا

بہت حد تک حالی کے مسدس کے سر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا تعلق ایک قوم کی حیات و موت سے ہے۔ اس کے اشعار درد و اثر اور سوز و گداز سے معمور رہیں ۔"

سدا سے ہی ایسے بد اشخاص ، استی کو دکھ دے کر خوش ہوتے ہیں اور ہر نئی جہت اور ہر نئے اطوار و مزاج کے خلاف سنگِ دنیا کا رول بہ خوبی نبھاتے ہیں۔ حالی کو ان کی یہ بدمعاشی تنگ کرتی رہی ہے لیکن مسدس ان کا سپر تھی انھوں نے تاریخ سے جو سبق سیکھا تھا اسے قوم تک پہنچانے کا فریضہ بہ حسن و خوبی ادا کیا غرض کہ حالی کا یہ تاریخی صحیفہ اردو شاعری کے لیے ایک ایسا اعلامیہ ہے۔ جو پیرایۂ اظہار، عملِ حرکیہ اور حقیقی آرٹ کا مظہر ہی نہیں سچی فکر کا ترجمان بھی ہے

۶

شعاعِ اُمید

اقبال زندگی کا احترام اور انسانی فلاح و بہبود پر ایمان رکھتے تھے۔ آرزو اور تمناؤں کو زندگی کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مسلسل عمل، خلوص، اور نیک نیتی کو مذہب کا لازمی جزو سمجھتے مانتے تھے۔ انھیں انسانی عظمت و توقیر کا پاس ولحاظ تھا۔ اور مقصدِ حیات کو انسانی ارتقار کا ایک زینہ مانتے تھے۔ منتظم، واضح، فلسفۂ وجودیت و بشریت کا تصور رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا مرکزی کردار یہی تصور ہے جو کبھی "مردِ مومن" کی صورت میں اور کبھی "مردِ کامل" کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

اقبال صرف شاعر یا فلسفی نہ تھے بلکہ وہ انسانی زندگی کے مانی و بہزاد بھی تھے۔ ان کی شاعری داغ کی زبان دانی سرسید کی تعلیمی تحریک اور حالی

کی ادبی توضیحات کے دائرے میں ارتقاء پذیر ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ ان کے اس شعری ارتقاء میں مغربی افکار و نظریات اور انگریزی شعراء کی رومانویت کا بھی خاصہ حصہ ہے۔

سرسید کی تحریک اور مشرقی روایات نے اُن کے کلام میں وطنیت کا تصور پیدا کیا جو بہت حد تک حالی اور غالب کی رومانوی فکر کا نتیجہ ہے۔ نیطشے، برگساں اور دوسرے حکمائے مغرب کے نظریات نے ان کی شاعری میں نئی آفاقیت پیدا کی۔ مولانا روم اور حافظ کی حکیمانہ فکر نے روحانی مسرت اور مارکس کے نقطہ ہائے فکر نے اقتصادی فکر کی ضرورت کا احساس دلایا۔

اگر ان کا ابتدائی کلام داغ کی زبان دانی اور تغزل کی یاد دلاتا ہے تو دوسری طرف وطنیت کا تصور حرکت و اعمال پر اکساتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قومیت اور وطنیت کے تصور کو ہمالہ، ترانۂ ہندی، آفتاب، ایک آرزو، نیا شوالہ، میرا وطن وہی ہے اور تصویر درد کے ذریعہ فروغ دیا۔ ان نظموں کے علاوہ گلِ رنگین، جگنو، چاند، کنارِ راوی، عہدِ طفلی، ابرِ کہسار، پرندے کی فریاد، خفتگانِ خاک سے استغفار، شمع و پروانہ اور شعاعِ امید وغیرہ نظموں میں بھی وہی بے چینی، اضطراب، تجسس اور تلاش کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے قومیت کے اس تصور کی مذمت کی جو رنگ و نسل کے امتیازات پیدا کر کے انسانوں کو تنگ نظری پر اکساتی ہے۔ ان کی شاعری یا ان کا نظریۂ قومیت انسانیت، مساوات، بھائی چارگی، دوستی اور وطنیت کا ہی درس دیتی ہے۔ مقصود یہ تھا کہ قومیت کو محدود دائرے سے نکال کر انسانیت اور مساوات کے دائرۂ عمل کو وسعت دی جائے تاکہ مغربی

نظریات وتصورات کی بیخ کنی کی جاسکے۔ اور ایسے سماج کی تشکیل کی جاسکے جہاں کسی نوع کی تفریق یا عصبیت نہ ہو۔ انھوں نے ایشیا کی عوام کے سامنے قومیت اور انسانی برادری کا اعلیٰ اور ہمہ گیر تصور پیش کیا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات، و رواداری اور اسلام کا شاندار ماضی اور اقوام عالم پر ادبی وسائنسی احسانات کو از سر نو تازہ کیا اور مسلمانوں کو ماضی کی دقیع روایات کو قائم رکھنے پر زور دیا۔ قومیت، رنگ ونسل، ذات پات اور اونچ نیچ سے بالا وہ دقیع حقیقت ہے جو تمام انسانی برادری کو ایک کرتی ہے اور انھیں کسی تفریق کے بغیر مساوی حقوق و فرائض منصبی عطا کرتی ہے۔ اور جو لوگ اس تفریق کو بڑھاوا دینے پر یقین رکھتے ہیں انھیں انسانیت یا مساوات سے کیا تعلق وہ تو اس کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ووٹ کی سیاست نے پوری ہندوستانی قوم کو ذات، دھرم، عقائد، علاقہ اور زبان کی بنیادوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ افسوس کہ سرکاری مشینری ہندوستانیوں میں خودداری و اعلیٰ شائستگی پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے یا وہ خود اس تفریق کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ سستے سیاست دانوں نے اس تفریق کو اور ہوا دی ہے۔ اور ایک دوسری قوموں کے درمیان نفرت وغیریت کی خلیج بڑھادی ہے۔ ذات برادری کے نام پر مانگی خوشیاں دیرپا نہیں ہوتیں۔ اور نہ یہ خودی یا نفس خودی کی پرورش کر سکتی ہیں۔

اقبال اس تفریق کے سخت مخالف رہے ہیں انھوں نے تمام انسانوں کو انسانیت کا ہی درس دیا ہے۔ "شعاع امید" کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما ہے۔ ضرب کلیم میں شامل یہ نظم ۱۹۳۰ء کے بعد کی تخلیق ہے۔ ضرب کلیم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

یہ مجموعہ فکر و فلسفہ کا معنوی استعارہ ہے۔ اس کی نظمیں اعلیٰ حقائق کی ترجمانی ہی نہیں منزل حیات کا رزمیہ بھی ہیں۔ "ضرب کلیم ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام" "شعاع امید" بھی اسی قبیل کی نظم ہے جس سے اقبالی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اقبال اس عبادت و ریاضت کے قائل نہیں جو زندگی کے اعمال و افعال سے الگ راستے پر جائے اور آدمی بےعملی کا نمونہ بن جائے۔ اصل عبادت عوامل حیات کو متحرک رکھنے اور حصول عرفان کا ذریعہ ہے۔

اقبال کا فکری نظام حرکت و عمل، تلاش و جستجو اور کوشش سعید سے عبارت ہے اور یہی فکر شعاع امید کی وجہ تخلیق ہے۔ اقبال نے اپنی اس فکر کو موثر بنانے کی خاطر ڈرامائی ٹیکنیک کو استعمال کیا ہے۔ اقبال نے لفظوں کی مدد سے معنی کا بدن چمکانے اور آہنگ کی جوت جگانے کی جو کوشش کی ہے اس کے پسِ رفت وہ ڈرامائی عناصر ہیں جس سے معنویت کی فضا تخلیق ہوتی ہے۔ یہ معنوی فضا دراصل ان کا وہ معنوی اسلوب ہے جس میں نظم و ضبط، خود کلامی، عمل اور ردِّ عمل کے وہ تمام عناصر ملتے ہیں جو لفظ کو بولنا اور چلنا سکھاتے ہیں اور ان کی جادوئی کیفیت کو جگائے رکھتے ہیں۔ جس کے جلو میں DRAMETIC LYRIC ڈرامیٹک لیرک پیش دستی کا حکم لگاتا رہتا ہے۔ خود کلامی کا یہ انداز نہ صرف ان کی نظموں میں بلکہ غزلوں میں بھی موجود ہے۔ شعروں میں یا نظمیہ بندوں میں ڈرامائی عمل کی جو نشانیاں ملتی ہیں وہ ڈرامے کے فنی عناصر پر نہ صرف مکمل کھری اترتی ہیں بلکہ موضوع کی ہمہ گیری کو الفاظ و تراکیب کی دل نشینی سے بولتے کرداروں کی اجلی رفاقت ملتی ہے اور انسانی سیرت بے نقاب ہوتی ہے۔ شاعر کی خود کلامی یا تخاطبی لہجہ ڈرامائی فضا کی تخلیق کا باعث

ہوتا ہے۔ ماں کا خواب، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، پیر و مرشد و شعاعِ امید وغیرہ اقبال کی ایسی ہی نظمیں ہیں جس کو براہ راست کرداروں کے ذریعہ مرتعش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ایک پرندہ اور جگنو وغیرہ میں حیوانی کردار چُنے ہیں۔ ان سے اخلاقی درس دلانے کا کام لیا ہے۔ شعاعِ امید ایک ایسی نظم ہے جس کے توسط سے انھوں نے کوشش عمل اور یقین کی شمعیں جلائی ہیں اور زندگی کیا ہے اس کی سچائی اور ضرورت کے تعلق سے اپنے اس فکری نوشتے کو مرتب کیا ہے جو ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔

"شعاعِ امید" فکر و فلسفہ کا عمدہ امتزاج ہے۔ یہ بہت چھوٹی سی دل آویز نظم ہے جس میں رمزیت، اشاریت اور ایمائیت کی مدد سے تجسیمی عمل کو نئی طاقت اور توانائی میسّر آئی ہے۔ چار چار اور نو اشعار پر مشتمل تین بند کی یہ نظم تمثیلی پیکر رکھتی ہے۔ خطابیہ عناصر سے ڈرامائی کیفیت اجاگر ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنے فکری نوشتے کو مزید موثر بنانے کے لیے مکالمے کی ٹیکنیک استعمال کی ہے اور یہ مکالمے سورج، شعاعوں اور ایک شوخ کرن کے ذریعہ ادا کرائے گئے ہیں۔ اس طرح اس نظم کے تین بنیادی کردار ہیں۔ پہلا کردار سورج کا، دوسرا شعاعوں کا مشترک کردار اور تیسرا شوخ کرن کا ایک الگ منفرد کردار۔ ان تینوں کے آمیزہ کردار کے ساتھ ریگ زار و لالہ زار، مشرق و مغرب، مردانِ گراں خواب، سازِ مضراب، برہمن اور مسلمان، بت خانہ و محراب، صبا، طوفِ گل و لالہ، تجلّی کدۂ دل نشیں، سیہ پوش، اجالا، صفت عالمِ لاہوت، سینۂ روشن، تاریک فضا، چشمِ مہ و پروین غواصِ معنی وغیرہ نہ صرف الفاظ اور استعارے ہیں بلکہ یہ وہ

جزویاتی کردار ہیں جن کے توسط سے فکر کو تابانی اور قوت میسّر آتی ہے۔ ان میں بعض کردار متحرک اور بعض جامد ہیں۔ جن سے دو فکری رویوں کا تضاد بھی ظاہر ہوتا ہے۔

شعاع امید کے ان تین بنیادی کردار کی مناسبت سے نظم کی تقسیم تین بندوں میں کی گئی ہے۔ پہلے بند میں سورج اپنی شعاع کو پیغام دیتا ہے۔ دوسرے بند میں شعاعیں سورج کے پیغام پر لبیک کہتی ہیں۔ تیسرے بند میں شوخ کرن عام شعاعوں سے مختلف ایک الگ ہی رویّے کا اظہار کرتی ہے۔ اگر سورج ماضی ہے تو شعاعیں حال ہیں۔ اور یہ شوخ کرن کل یعنی مستقبل کا اشاریہ۔ اقبال نے ماضی و حال کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے لیکن کل یعنی تیسرے بند کو اعتماد و یقین کا مظہر قرار دیا ہے۔ رجائیت کو شوخ کرن سے مشبّہ کیا ہے۔ سورج کی ٹوٹتی توقع اور اس کی مایوسی پہلے بند کا موضوع ہے۔ وہ شعاعوں کو زمین کی تاریکی اور بدّیہ خصلتوں کو بدلنے کا پیغام دیتا ہے اور جہاں جہاں ممکن ہو روشنی پھیلانے کی کوشش کرو تاکہ نفاق و جہل، شر، فساد اور بے عملی کی نشو و نما رک جائے۔ ہزاروں سال سے سورج کرۂ ارض کو روشن کرنے کی تدبیریں کرتا رہا ہے مگر نامرادی ہی ہاتھ آئی۔ وہ اپنی شعاعوں کو واپس لوٹ آنے کے لیے حکم دیتا ہے۔ لوٹ آؤ تمہاری کوششیں بار آور نہیں ہو سکیں اور نہ شاید ہو سکیں۔ تم نے کرۂ ارض کو درخشاں و تابندہ بنانا چاہا۔ اسے نیّروں سے سجانا چاہا۔ تکلیفیں اٹھائیں۔ ریاضت و محنت کی سبیلیں لگائیں۔ منفی نتائج کو دیکھتے ہوئے سورج نے انھیں اپنے مسکن کی طرف لوٹ آنے اور سینۂ خورشید میں سما جانے کے لیے کہا۔

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پنہائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

صبح و شام کے ان دونوں رنگوں میں تم نے مشترک خوبیاں تلاش کیں۔ اس دورنگی میں یک رنگی قائم کرنی چاہی۔ گل و لالہ کی خوشبو، راحتیں، محبتیں بانٹنی چاہی مگر تاریکی روشنی کو اپنا مطیع بنانے، اس پر غلبہ پانے، اسے ختم کر دینے کی کیا کیا کوششیں نہیں کرتی رہی ہے اور زمانہ اس تضاد و افتراق کے درمیان خود کو گزارتا رہا اور آگے آنے والے کل کی امیدیں تلاشتا رہا اور ادھر تاریکی بمعنی جہل و فساد، فتنہ و ہیجان، نفاق و دشمنی، غیریت دوری، نفرت، کرۂ ارض پر توانا ہوتی رہی۔ سورج نے شعاعوں کی اس کسمپرسی، مایوسی، اور بد دلی کو دیکھتے ہوئے واپسی کی تلقین کرتا ہے۔

دوسرا بند جو سورج کے حکم بجا لانے سے منسوب ہے۔ نظم کا دوسرا کردار یہی شعاعیں ہیں۔ سورج جو پہلا کردار ہے اس کا حکم بجا لاتی ہیں۔ کرۂ ارض سے

واپس لوٹ جاتی ہیں۔ انھیں اپنی کوششوں، چاہتوں کے رائیگاں جانے کا افسوس بھی ہے نئی سائنسی حکمت عملی، صنعتی نظام اور مشین و آلات نے مغربی ممالک کی طرح، مشرقی ممالک کو بھی مادّہ پرست بنا دینے کی کوشش کی ہے۔ مشرقیت بے عملی کا جامہ پہن چکی ہے۔ حرکت نے جمود کی جگہ لے لی ہے۔ یہ بند انسانی اقدار کی شکست و ریخت کا مرثیہ ہے۔ اقبالؔ نے پہلے ہی مشین و آلات میں دبے انسان کو باہر نکالنے کی سعی کر چکے تھے اور مغربی اطوار و طرائق کی مذمت کر چکے ہیں۔ شعاعیں جب ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹتی ہیں تو سورج انھیں پھر اپنی آغوش میں سما لیتا ہے۔

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّت نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہر جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

تیسرا بند شوخ کرن کے کردار و عمل پر محیط ہے۔ یہ وہ کرن ہے جو ابھی مایوس یا نامراد نہیں۔ یہ وہ سیماب صفت کرن ہے جس کی فطرت میں ہی بے قراری ہے۔ وہ مایوس ہونا یا ٹھہر جانا نہیں جانتی۔ وہ حرکت و اعمال پر یقین

رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریک فضا کو اور اس کرۂ ارض کو اکیلا تنہا چھوڑ دینا نہیں چاہتی ہے۔ وہ ہندوستانی فضا کو خوش گوار، آزاد اور خود دار دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ واپس نہ جا کر اس عزم و ارادے کا برملا اظہار کرتی ہے۔ جب تک گہری نیند میں سوتے ہوئے ہندوستانیوں کو جگا نہیں لیتی، انھیں بیدار نہیں کر لیتی ان کی امید و غیرت و خودداری کو نہیں لوٹا لیتی۔ وہ اپنی جدّ و جہد اور کوشش جاری رکھنے پر اصرار کرتی ہے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

سرزمین ہند کی عاشق و شیدا یہ شوخ کرن خاکِ ہند کی عظمت کی نہ صرف معترف ہے بلکہ اپنے آقا (سورج) اور اقبال کی منشا و خوشی کو عزیز رکھتی ہے

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

ہندی زمین پر اسی بے حسی و عملی کو دیکھ کر رنج و افسوس بھی کرتی ہے یہ کیسی زمین تھی کیسے لوگ تھے اور اب یہ کیا سے کیا ہو گئی ہے یا بنا دی گئی ہے۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے، بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اور آخری شعر اس مقام پر ختم ہوتا ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کا یہ پیغام کوئی نیا پیغام نہیں ہے وہ اس پیغام کو خضرؑ کے توسط سے قوم کو دے چکے ہیں۔ وہ عموماً براہ راست کوئی پیغام نہ دے کر کہیں ڈرامائی ٹیکنیک کا یا کہیں علامتی پیرایہ کی مدد لیتے ہیں۔ غرض کہ ضرب کلیم کی یہ مختصر سی نظم اپنی تجسیمی صفات اور تمثیلی عمل کا وہ عمدہ نمونہ ہے جس میں فکر و شعر کا امتزاج بھی ہے اور رجائیت کی روشنی بھی۔

خاکِ ہند

چکبست نے اجتماعی اور عوامی زاویۂ نظر کی اہمیت محسوس کی اور اپنی شاعری سے جمود، غفلت، کاہلی اور مردہ جذبات کو نئی تازگی بخشی اور اپنی نغمہ آرائی سے قوم کو جگانے کا کام لیا۔ اور اپنی تمام توجہ قومی اور حب الوطنی کے جذبہ کو طاقت و توانائی دینے میں صرف کی اور بلا امتیاز تفریق مذہب انسانی رشتے کو فروغ دیا۔ ان کی زیادہ تر نظمیں وطنیت کے جذبات ابھارنے اور قومی احساس کو جگانے کا موثر وسیلہ بنیں۔ وہ جس خیال کو نظم کرتے ہیں اس کی سچی اور ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ "صبح وطن" جو ان کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس نام سے ہی ان کے بنیادی جذبہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہندوستان کو تمام قوموں اور فرقوں کا مقدس وطن سمجھتے ہیں۔ فریادِ قوم، دردِ دل،

وطن کا راگ، آوازۂ قوم اور خاک ہند اسی فکر و احساس کی منہ بولتی نظمیں ہیں۔ ان کا درج ذیل شعر اسی فکر و احساس کا نمائندہ ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

وہ تمام ہندوستانیوں کو ایک لڑی میں گندھا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے فرد کے دل میں وطن کی سچی محبّت کا بیج بونا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے اسلاف، ہندیائی تمدّن، تاریخ عظمیٰ اور ہندی روایات سے گہری عقیدت تھی۔ جس نے ان کی نظموں میں مساوات اور رواداری کی کیفیتوں کو مجسّم کر دیا تھا۔ وہ سربراہان قوم کی وفات و شہادت پر جیسی رثائی نظمیں تخلیق کی ہیں وہ شخصی مرثیہ کی عمدہ مثال ہیں۔ غرض یہ "خاک ہند" ان سب کا مجموعی تاثر رکھتی ہے۔ یہ نظم حبِّ وطن کی تعلیم بھی دیتی ہے اور انسانی رشتوں کی اہمیت و افادیت کا احساس بھی دلاتی ہے۔

مسدس کے فارم میں لکھی گئی یہ نظم خاک ہند نو ۹ بندوں پر مشتمل ہے شروع کے دو بند میں ہندیائی تمدّن اور اس کی عظمت کہنہ کی ثنا کی گئی ہے۔ تعریف و توصیف سے مزیّن یہ ابتدائی بند چکبست کے فکری اور جذباتی رشتے کا مثبت اظہار ہیں۔ چکبست عصری مسائل اور سیاسی و سماجی تضاد و اضمحلال کے ہر اس اتار چڑھاؤ سے واقف تھے جو مغربی حاشیہ برداروں نے وطن عزیز کے سورماؤں کے خلاف انگریزوں کی نمک خواری میں اپنا دین و مذہب اخلاق و ورثہ سب بیچ دیا تھا۔ اُن کی آنکھوں کی بینائی حرص و حوص نے چھین لی تھی سماعت ہوا ہو گئی۔

تھی۔ احساس کی طہارت کا تصور محال تھا۔ یہ گونگے بہرے ہندوستانی خود اپنے وطن کی عظمت و بزرگی کے نغمات سُننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی یہ وہ نغمات تھے جسے اکبرؔ و اقبالؔ۔ سرورؔ و اسمٰعیلؔ اور چکبستؔ اپنی اپنی دھنوں میں گا رہے تھے۔

چکبستؔ کی خاک ہند ۱۹۰۵ء کی تخلیق ہے۔ اس کے وہ ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزّ وشاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری چشم و چراغ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمع ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

چکبستؔ نے "خاک ہند" کی عظمت و بڑائی کو اجاگر کرنے کے لیے اس ہندیائی روایت کو یاد کیا جو ہزار ہا سال کی تعمیر و تشکیل کا مصدر نامہ ہے۔ اور اسے زندگی کی مثبت قدروں کا امین اور مشعل راہ قرار دیا۔ انھوں نے ہندوستانی

عزم کو سرسید کی قربانی، اکبر کی انسان دوستی، رانا کی جاں فشانی اور گوتم کی محبت

کی یاد دلا کر ہندی جوانوں میں جینے کی تڑپ، عزت و خود داری کی رمق حوصلے کی امنگ شجاعت و دلیری اور ایثار و قربانی کا سبق دیا۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو   سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے نام الفت بخشا اس انجمن کو   سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

چکبست ایک ایسے محب وطن شاعر ہیں جنھوں نے انسان دوستی، وطنیت اور اخلاق و مروّت کے امتزاج سے ایک اچھے معاشرے کی تشکیل دینے کی تمنا کرتے تھے اور ہمیشہ انیکتا میں ایکتا کی خوشبو محسوس کی تھی۔ کثرت میں وحدت کی روشنی تلاش کی تھی۔ منجملہ بیش تر نظموں کی طرح اس چھوٹی سی نظم میں بھی اس خوشبو کی قوس قزح روشن نظر آتی ہے۔ ناقوس، اذان، کشمیر اور گنگا کے استعاروں میں اسی دوستی کی اور محبتوں کی اجلی کیفیات کو اجاگر کیا ہے اور ہمارے دلوں میں اتفاق و رواداری کی شمعیں روشن کرنے اور انھیں قائم و دائم کرنے کی دعا کی ہے۔

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے   اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے   فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

ہمالیہ، چین و عرب، یونان، گوتم، سرمد، اکبر، رانا، ناقوس، اذان، کشمیر، گنگا، طاؤس، جنت، صور، حُبِّ قومی، شرارہ، خمار، سرو سمن، بلبل، باغ، جوئے شیر، مہر، برگِ گل، گرد و غبار، خاکِ وطن، کفن، نورِ سحر، خوابِ گراں، علم و کمال و ایماں، عیش و طرب، صورِ افسردگی، شیدائے بوستاں، نورِ حُسنِ ازل، فیضِ قدرت، زیب و زینت، چشم و چراغ، معبدِ کہن، رنگِ سخن، برگِ گل اور خلعت وغیرہ جیسے لفظوں، ترکیبوں اور استعاروں کے ذریعے انھوں نے وطن کی محبت اس کا ماضی اور حال کا ذکر کہیں بہت خوش روی کے ساتھ، کہیں احترام و عقیدت کے ساتھ اور کہیں رنج و افسوس کے ساتھ کیا ہے اور جب کہیں یاسیت کا سایہ نظر آیا ہے وہیں رجائیت کی شبنم بھی چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ کھنڈر، پستی، پریم، سماں، اجل، افسردگی، خوابِ گراں، لاش بے کفن، عیش و طرب کے بندے، برباد، مردہ طبیعت، راکھ اور بیکس جیسے الفاظ و تراکیب سے یاسیت، ناکامی اور پسپائی کے منفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں جو انگریزوں کی سیاسی حکمتِ عملی کے باعث ہندی قوم میں پیدا ہو رہی تھی۔ چکبست یاس و محرومی کو عظمتِ ہند کا نغمہ سُنا کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ان خراب حالات میں خاکِ وطن پر پھیلی مایوسی کی ہر اس چادر کو ہٹا دینے کا حوصلہ رکھتے تھے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

تازگی، رقص، نور، سرور، کڑک، شرر، بشر، جلوہ، خلوت، فیض، اوج، صبح، ضیا، آبیاری، چراغ، شمع ادب، دانش، الفت، رنگ، جنت، شوکت، روشنی وغیرہ وہ رجائی الفاظ ہیں جن کی مدد سے انھوں نے فکر و شعور کی ایسی شمع روشن کی ہے جو حب الوطنی کا راستہ دکھاتی ہے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرّہ اس منزل کہن کا
تُلتا ہے برگِ گُل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یہاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

غرض کہ یہ چھوٹی سی نظم بہت ساری ان بڑی نظموں پر بھاری ہے جو یں انسانی شرافت کا اور حب الوطنی کا درس دیتی ہے، وہ لوگ مبارک باد ے مستحق ہیں جنھوں نے مادرِ وطن کی عزت و ناموس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں ں اور ملک و قوم کی سرفرازی کے لیے غلامی کا طوق توڑ دینے کے لیے اور

آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے قلمی جہاد کیا۔ اور قلم سے وہی کام لیا جو ایک بہادر سپاہی میدان جنگ میں تلوار سے لیتا ہے۔

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک   رنگین طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک   ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

کسان

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی (ولادت بقول خود ۱۵ دسمبر ۱۸۹۸ء) کی شخصیت میں نسلی اور قومی خصوصیات کی تمام تر خوبیاں جلوہ گر ہیں۔ جوش کے ادبی پس منظر میں لکھنؤ کی تہذیبی روایات اور شاعرانہ فنکاری بھی موجود ہے لیکن موضوعی اور ہیئتی اعتبار سے جوش کی شاعری لکھنؤ کی دبستان شاعری سے بہت مختلف ہے۔ وہ شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر شباب بھی ہیں۔ اُن کے ہاں اِن دونوں کا مساوی امتزاج ملتا ہے جو اُن کی تعمق رسی اور بلند آہنگی کا غماز ہے۔ انھوں نے اپنے دامن شعری میں فطرت کی رنگین وسعتیں سمیٹ لی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو آپ بیتی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُسے جگ بیتی کی سرحدوں تک پہنچا دیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری

"عصر حاضر کی فضا میں سانس لیتی ہے"، (کلیم الدین احمد) ان کی شاعری میں زندگی کے گوناگوں تجربات اور اس کی تعبیریں ملتی ہیں۔ جوش کا شاعرانہ لہجہ ان کے مزاج اور ماحول کا پروردہ ہے۔ ان کی شعری زندگی غزل سے ہی شروع ہوتی ہے لیکن حالی اور آزا کی نظم نگاری کی تحریک اور سرسید کی فکری تحریک نے ان کے دائرۂ احساس کو مزید وسعت عطا کی۔ ان کی ابتدائی نظموں میں غزلیہ گداختگی کا ہی پرتو دکھائی دیتا ہ وہی رعنائی اور رنگینی، ہجر و وصال کے قصّے، رندی و سرمستی اور نشاطیہ مضامین ان کا پہلا مجموعۂ کلام روح ادب، ۱۹۲۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس دور ک ابتدائی نظموں میں گریۂ حسرت، طوفان بے ثباتی، انتظار کے آخری لمحے، دنیا پانچ نغمے، فلسفۂ حیرت وغیرہ اہم ہیں۔

"کسان" ان کے پانچویں مجموعۂ کلام شعلہ و شبنم سے ماخوذ ہے۔ یہ مجموعۂ کلام ۱۹۳۶ء میں دہلی سے ہی شائع ہوا۔ اسی سال ان کا تیسرا مجموع "نقش و نگار" بھی شائع ہوا۔ لیکن شعلہ و شبنم، نقش و نگار سے بہت مختلف، انقلابی فکر سے آراستہ ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر انھیں شاعر انقلاب کہا گیا۔ شعلہ و شبنم میں پیمانِ محکم، صدائے بیداری، لمحۂ آزادی، شکستِ زندا کا خواب جیسی انقلابی نظمیں شامل ہیں جو اسی عہد کی سیاسی کشمکش اور سماجی جدو کا وسیلۂ اظہار رہیں۔ ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے۔

> "شعر کے حسین آبگینوں میں انقلاب کی تیز و تند شراب اس سے پہلے اردو کی بزم میں کہیں نہیں دیکھی تھی۔"

"کسان" اسی انقلاب کا ایک استعارہ ہے۔ نظم کی ابتدا شام ک

دھندلی ہوتی ساعتوں سے ہوتا ہے اور ختم گھر لوٹتے وقت وہی تاریکی جو سورج کے قطع سفر پہ ہوتی ہے۔ وہی سیاہی اس کے گھر میں افلاس کی صورت میں۔ اسی باعث یہ سیاہی کسان پر ہیجانی کیفیت طاری کر دیتی ہے لیکن جوشؔ نے اس قنوطیت کو رجائیت میں تبدیل کر دینے کا ہنر بھی بخش دیا ہے۔

کسان جوشؔ کی ترقی پسندانہ فکر کی ترجمان ہے۔ نظم کا پہلا بند دس شعروں پر مشتمل ہے جو منظر نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ شام کی دلکشی اور اس کی پیش روی کا جیسا خلاقانہ ڈھنگ اختیار کیا گیا وہ جوشؔ کی مشاہدانہ قوت کا مظہر ہے۔ دریا، شفق، میدان، کھیتیاں، آفتاب، دشت، دن، چراغ، ارض و سما، گردوں، دود، سورج، مشرق، شام، سبزہ، افسردہ، سنسناہٹ، خنکی، گرمی، تیرگی، خاروخس، دوب، شبنم، چرخ، بادل، زمین، تتلیاں، طیور، ابر، دھنواں، آسمان، پتیاں، کلیاں، گردوں کے ذریعہ شام کی جو دلکش تصویر بنائی ہے۔ ایک تجربہ کار ماہر مصور کی طرح جیسا خوبصورت اور متناسب اور حسب محل رنگوں کا استعمال کیا ہے وہ ان کی تجرباتی کشمکش کا مظہر بھی ہے۔ یہ الفاظ کسی فکر یا احساس یا جذبہ کا اثبات ہی نہیں "کل" کا اشاریہ بھی ہیں۔ جوشؔ نے شام کے استعارے میں اس گہری ہوتی ہوئی سیاہی میں لہو کے قطرے، درد کی آواز، اور وقت کی خلش محسوس کی ہے جو نظم کے اگلے حصوں میں یہی خاموشی ہیجان یا طوفان بن جاتی ہے۔ جوش کا یہ انقلابی میلان اس عصری تقاضے کو متحرک کرنے میں کامیاب ہے۔ منظر نگاری کا یہ کمالاتی حسن ان کی مصورانہ فکر کو واضح کرتا ہے،

زیرِ لب، ارض و سما ہیں، باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
دوب کی خوش بو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھنواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں
پتّیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آئی ہوئی

دوسرا بند کسان کی تعریف، اس کی طاقت۔ کسان کی جو صفتیں یا خصوصیتیں گنائی ہیں وہ اس میں غلو یافتہ فکر بھی ملوث ہو گئی ہے۔ انھوں نے کسان کو جس دقیع و رفیع خطابات سے نوازا ہے۔ وہ انسان کی خطابیہ شاعری اور لفظی دروبستگی کی اچھی مثال ہے۔ مثلاً وہ کسان کو ارتقاء کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار، طفل باراں، تاجدارِ خاک، امیر بوستاں، ماہر آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں، ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ، ناز پرور، کھیتوں کا بادشاہ، وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم، محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم، صبح کا فرزند، خورشید زر افشاں کا علَم، محنت پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم، جلوۂ قدرت کا شاہد، حُسنِ فطرت کا گواہ، ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ۔ ایسے مقتدر القاب و آداب سے نوازا ہے۔ ایک ہندوستانی کسان کی وہ تصویر بنائی ہے جو

شاید ہی کبھی لائق اعتبار بن سکے۔ جس ملک میں آج بھی محنت، کوشش، راستی، نیکی، حلیمی، خودی، اعتماد، وعدہ، علم، عبادت، خاموشی اور دانشوری کو وہ قدر و منزلت نہیں مل سکی جو ظلم، تعصب، بدی، سُستی، دھوکا، فریب، جہالت، تکبّر، رعونت، نفاق، ہنگامہ، شر، فساد، نفرت، عداوت، خود غرضی بے حسی بے ادبی، جھوٹ، مکاری، عیاری، بد کلامی، گداگری، مفت خوری، بھیک، بد کلامی، لالچ، حرص، ہوس کو ملی ہوئی ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں بیش تر دنیا پرست یا جاہ پرست، رعونت، دولت، امارت، شوکت، وجاہت، اور حاکمیت کے دلدادہ ہیں۔ جاہ و منصب کے لیے وہ سب کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جو ۴۰ برس پہلے بہت کم ہندوستانی سوچتا تھا۔ ذات برادری کے نام پر وہ کتنا نیچے گر سکتا ہے وہ آج کے سیاسی پردے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بظاہر آج کا نیا آدمی زیادہ خوش حال نظر آتا ہے۔ مکان پختہ ہو گئے ہیں۔ بدن پر صاف شفاف لباس نظر آنے لگا ہے۔ اچھی اور قیمتی سواریاں میسّر آ گئی ہیں مگر اخلاق سطح پست ہو گئی ہے۔ قدریں لہو ہو رہی ہیں۔ شرافت کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے۔ ادب و لحاظ کے پرخچے اُڑ رہے ہیں۔ علم کو مادّی حصول کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ استاد کا احترام ختم ہوتا جاتا ہے۔ نئے زمانے کے مادی ترقی کی یہ ایسی گھنونی شکل ہے جسے مادّہ پرست مغرب زدہ افراد وجاہت قرار دیتے ہیں۔

کسان جس کا رشتہ زمین سے تھا اور زمین کا اس سے تھا۔ اس رشتے کو آج کے معاشی رویّے نے کمزور کر دیا ہے۔ کسان کو جو روحانی خوشیاں تمام تر خراب حالات کے باوجود میسّر تھیں، مشینی آلات نے ذبح کر دیا ہے اور آج ہم پھر عہدِ جہانگیری کی طرح مغرب کی آقائیت قبول کرنے پر اتاولے ہوئے جاتے ہیں۔

یہ ہندوستان جو کسانوں کا تھا کسانوں نے ہی اس عزت و ناموس کی حفاظت کی تھی۔ یہ کسان عابد بھی تھا، حکیم بھی، استاد بھی اور سپاہی بھی۔ یہ ہل بیل طاقت کی علامت تھی۔ مگر سیاسی ہتھ کولوں نے کسان کو اس کے اصل منصب سے اتار کر مشینوں کا تابع بنا دیا ہے۔ یہ کمپیوٹر اور راکٹس ہماری روحانی شکستگی کا سامان ہیں۔ کسان کو انگریزوں نے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اور آج کے سیاسی گھٹالا بازوں نے اس کی خود اعتمادی چھین کر بیساکھی تھما دی ہے۔

جوشؔ نے شروع کے چھ شعروں میں کسان کی فضیلت بیان کی ہے اور پھر آخری ۱۴ شعروں میں اس کی محنت و مشقت اور جاں فشانی کا اچھا نتیجہ اخذ کیا ہے مواخذے کی یہ شکل مشاہدانہ تجربے کا ہی ایک حصّہ ہے۔ یہ ہندوستانی کسان کتنا سادہ دل اور صلح جو ہے۔ صبر و قناعت کا پیکر بھی۔ وہ زمینداروں، ساہوکاروں، نوابوں، رئیسوں، حاکموں اور رائے صاحبان کے لیے جیتا ہے۔ انھیں خوشیاں، راحت اور آرام کا ہر سامان مہیّا کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتا ہے۔

ساز و دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبض استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تنِ آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدّن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

—

کسان کی یہ پُر عظمت توقیر زمینی رشتے کا مظہر ہے۔ وہ زمین شناس بھی، آسماں شناس بھی۔ زمین کے رنگوں، آسمان پر ٹمٹماتے تاروں، موسمی بادل، ہوائیں، اوس کے قطرے، طائروں کی آوازوں کا رازدار بھی اور دوست بھی۔ وقت اور ماحول کا ایسا مطرب جس کا ہر عملِ حرکیہ زندگی کی حرارت سے ہم رشتہ ہے۔ اسی لیے جوشؔ نے اس کی شخصیت کو بے نقابی عطا کردی ہے اور برملا کہا ہے۔

جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو

—

شعلہ خو جھونکوں کا ہم دم، تیز کرنوں کا رفیق

—

منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام

—

جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک

—

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب

—

لیکن اس کے فوری بعد ہی کسان کی وہ تصویر دکھا دی ہے جو زیادہ سچی اور معتبر ہے۔

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

—

پھر نظم کا تیسرا بند "ہل" کی تعریف، حیثیت اور اہمیت پر مشتمل ہے۔ یہ آٹھ شعروں کا مختصر بند ہے۔ ظلمت شکن، قندیل، گلشن، دریچہ، دل، بانی، سراغ، چشم و چراغ، دھار، پیام، ہلال، عید اور کرن جیسے لفظوں سے اس کی نسبت قرار دیتے ہوئے قصیدہ گوئی کی ہے۔ اس سے ہل کی اہمیت ہی واضح نہیں ہوتی بلکہ اسے مادّی ترقی کا ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

خوش نما شہروں کا بانی رازِ فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ

—

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام

جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں

—

جس کی تابش میں درخشانی ہلال عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

—

معنی خیز ترکیبوں اور استعاروں سے فکر و احساس کی اچھی تصویر بنائی ہے۔ محاکات کا رنگ بھی نمایاں ہوا ہے۔

چوتھا بند کسان کی مفلوک الحالی کے بیان پر مشتمل ہے۔ کمزور، ناتوان، مایوس، بدحال کسان کی وہ تصویر کھینچی ہے جو ہندوستان کا مقدر رہی ہے۔ لیکن اب آج کے حالات میں وہ تصویر بدل گئی ہے۔ جوش کی یہ تصویر سچی اور بے لاگ ہے۔ ان پر غلو یافتہ رنگ کا کہیں بھی کوئی چھینٹا نہیں۔ کسان اور اس کے اہل و عیال کے جذبات اور ظاہری حالات کی عکاسی کرتے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شباب سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

آخری بند غیض و غضب کا اعلامیہ بن گیا ہے۔ ظلم و ناانصافی کے خلاف ان کا انقلابی آہنگ عصری حالات سے ہم رشتہ ہے۔ اس بند سے جوش کی انقلابی فکر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی فکری استعجاب نے جوش کو شاعر انقلاب کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت! ساری کائنات

—

بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھو اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

آخر میں استحصالی قوت اور سرمایہ داری پر لعنت و ملامت کے ساتھ خبردار کرنے کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ ایسا انقلابی ہے جو انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف نبرد آزما ہے

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب میں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

—

غرض کہ یہ نظم جو منظر نگاری سے شروع ہو کر انقلابی پیغام پر ختم ہوتی ہے۔ جوش کا شاہ کار ہے۔

● ●

آدمی نامہ

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی　　اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی　　چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال، قطب، غوث، ولی آدمی ہوئے　　منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لیے　　حتّیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور　　یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دُور
کُل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور　　شیطان آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہ نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں　　اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی مسافر ہو، لے کے مال　　اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال　　سچّا بھی آدمی ہی نکلتا ہے، میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا　　اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا　　گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بدشکل، بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا یہ شرق ہیں　　کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر　　یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کارِ دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر　　اچھّا بھی آدمی ہے کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسدسِ مدّ و جزرِ اسلام

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب منبر   تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
کیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور   سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب"

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی   عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی   اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا   حقیقت کا گُر ان کو اک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا   بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا
کھُلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق   زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق   اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لَو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم   اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم   اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کی بڑائی

جتائی انھیں وقت کی قدر و قیمت — دلائی انھیں کام کی حرص و رغبت
کہا چھوڑ دیں گے سب کی آخر رفاقت — ہوں فرزند و زن اس میں یا مال و دولت
نہ چھوڑے گا پر ساتھ ہرگز تمہارا
بھلائی میں جو وقت تم نے گزارا

سکھائی انھیں نوع انساں پہ شفقت — کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسایہ سے رکھتے ہیں وہ محبّت — شب و روز پہنچاتے ہیں اس کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں

اِدھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا — کہ تھا گیان گُن کا لدا یاں سے ڈیرا
اُدھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا — کہ دل سب نے کیش و کنش سے تھا پھیرا
نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں میں
نہ یزداں پرستی تھی یزدانیوں میں

ہوا ہر طرف موج زن تھی بلا کی — گلوں پر چھری چل رہی تھی جفا کی
عقوبت کی حد تھی نہ پرسش خطا کی — پڑی لٹ رہی تھی ودیعت خدا کی
زمیں پر تھا ہر ہر ستم کا دڑیڑا
تباہی میں تھا نوعِ انساں کا بیڑا

گھٹا اک پہاڑی سے بطحا کے اٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی — جو ٹیکسس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا اُمّیوں نے جہاں میں اُجالا   ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا   ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانے میں پھیلائی توحیدِ مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آوازِ حق

ارسطو کے مُردہ فنوں کو جلایا   فلاطوں کو پھر زندہ کر کے دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا   مزہ علم کو حکمت کا سب کو چکھایا
کیا ہر طرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

سدا اُن کو مرغوب سیر و سفر تھا   ہر اک برّ اعظم میں ان کا گزر تھا
تمام ان کا چھانا ہوا بحر و بر تھا   جو لنکا میں ڈیرا تو بربر میں گھر تھا
وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو
گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در کو

رہے جب تلک ارکان اسلام برپا   چلن اہل دیں کا رہا سیدھا سادا
رہا میل سے شہد صافی مُصفّا   رہی کھوٹ سے سیم خالص مُبرّا
نہ تھا کوئی اسلام کا مرد میداں
علم ایک تھا شش جہت میں دُرافشاں

بُرے اُن پہ وقت آ کے پڑنے لگے اب   وہ دنیا میں بس کر اجڑنے لگے اب
بھرے اُن کے میلے بچھڑنے لگے اب   بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کھُل گئی سارے عالم پہ چھا کر

نہ ثروت رہی اُن کی قائم نہ عزّت — گئے چھوڑ ساتھ اُن کا اقبال و دولت
ہوئے علم و فن اُن سے ایک ایک رخصت — مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت
رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

نہ قوموں میں عزّت نہ جلسوں میں وقعت — نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت — خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم — نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم — نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصّہ ہمارا ہے سوداگری میں

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں — ہنر اور پیشہ کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں — فرنگی پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

کریں نوکری بھی تو بے عزّتی کی — جو روٹی کمائیں تو بے حرمتی کی
کہیں پائیں خدمت تو بے غیرتی کی — قسم کھائیے ان کی خوش قسمتی کی
امیروں کے بنتے ہیں جب یہ مصاحب
تو جاتے ہیں ہو کر حمیّت سے تائب

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر   تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تواں گر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر   نہ عقل ان کی ہادی نہ دیں ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا   نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا   تعیش میں جینا نمائش پہ مرنا
سدا خواب غفلت میں بے ہوش رہنا
دم نزع تک خود فراموش رہنا

وہ ملک اور ملت پہ اپنی فدا ہیں   سب آپس میں اک ایک کے حاجت روا ہیں
اُولوالعلم ہیں ان میں یا اغنیا ہیں   طلبگار بہبود خلقِ خدا ہیں
یہ تمغا تھا گویا کہ حصہ انھیں کا
کہ حب الوطن ہے نشاں مومنیں کا

امیروں کی دولت غریبوں کی ہمت   ادیبوں کی انشا حکیموں کی حکمت
فصیحوں کے خطبے شجاعوں کی جرأت   سپاہی کے ہتھیار شاہوں کی طاقت
دلوں کی امیدیں امنگوں کی خوشیاں
سب اہل وطن اور وطن پر ہیں قرباں

عروج اُن کا جو تم عیاں دیکھتے ہو   جہاں میں انھیں کامراں دیکھتے ہ
مطیع اُن کا سارا جہاں دیکھتے ہو   انھیں برتر از آسماں دیکھتے ہ
یہ ثمرہ ہیں اُن کے جواں مردیوں کے
نتیجے ہیں آپس کی ہمدردیوں کے

وہ علم شریعت کے ماہر کدھر ہیں   وہ اخبار دیں کے مُبصّر کدھر ہیں
اصولی کدھر ہیں مناظر کدھر ہیں   محدّث کدھر ہیں مُفسّر کدھر ہیں
وہ مجلس جو کل سربسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے   مصیبت میں یاروں کے غم خوار ہوتے
سب اک اک کے باہم مددگار ہوتے   عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے
جب الفت میں یوں ہوتے ثابت قدم ہم
تو کہہ سکتے اپنے کو خیر الامم ہم

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے   کہ آلودہ اس خوان میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگذر ہے   نہ مُلّا نہ صوفی کو اس سے حذر ہے
اگر نشۂ مے ہو غیبت میں پنہاں
تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں

اگر مرجع خلق ہے ایک بھائی   نہیں ظاہرا جس میں کوئی برائی
بھلا جس کو کہتی ہے ساری خدائی   ہر اک دل میں عظمت ہے جس کی سمائی
تو پڑتی ہیں اُس پہ نگاہیں غضب کی
کھٹکتا ہے کانٹا سا آنکھوں میں سب کی

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے   تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے   کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں   ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں   کہ راجہ کے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن واماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
کرو قدر اس امن و آزادگی کی   کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی   یہ ہر سُو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے
وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے   جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے   نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

● ●

شعاعِ اُمّید

(١) سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
مُدّت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایّام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوف و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیلاں و در و بام

---

(٢) آفاق کے ہر گوشے سے اُٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّتِ نظّارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھُپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳) اک شوخ کرن ، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفت جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب!
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُت خانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو
سب سورَبیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے　　اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں   کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں   پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گُل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن وہی ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا   دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا   اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صُورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا افسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو سُمن مبارک   رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک   ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا   آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کُہن کا   تُلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود
وسعتِ میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گِلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلہ
خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے رُوٹھ کر جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھُواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں، اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علم
محنتِ پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ
قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب   اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرورِ گلاب
قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق   شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب   جس کے سر پہ جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو   جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر   دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک   جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک

سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ   مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں   لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار   کرتی ہے دریوزۂ تابش کُلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی   جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ   جس کی ظلمت سے ہتیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں   کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل   قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دِل
خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سُراغ   خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام   شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا   مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں   کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن اُمّید کی

جس کا مَس خاشاک میں بُنتا ہے اک چادر حسین
جس کا لوہا مان کر، سونا اُگلتی ہے زمین

ہَل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سُرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اُس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے مُلکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پہ نگاہ
پِھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شبابِ سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا

سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری! ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم اے حامیِ امن و اماں!
گُرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
ادّعائے پیرویٔ دین و ایماں، اور تو!
دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا! اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

فرہنگ

آدمی نامہ:

ابدال (ع۔ مذکر) اہل تصوف کے نزدیک اولیاء اللہ کا وہ گروہ جس کے سپرد دنیا کا انتظام ہے۔

اشراف (ع۔ مذکر) شریف کی جمع۔ مہذب اور شائستہ لوگ

امام (ع۔ مذکر) پیشوا۔ نماز پڑھانے والا۔ تسبیح کے اوپر والا لمبا دانہ

بہا (ف۔ مذکر) قیمت۔ مول

بے (ف) حرف نفی۔ بغیر۔ بن۔ سوا

بے نوا (ف) بے سامان۔ فقیر۔ بے کس

پادشاہ (مذکر) بادشاہ۔ سلطان

پیر (ف۔ مذکر) ضعیف۔ بزرگ۔ مرشد

تاش (ہ) ایک کھیل۔ زربفت

تیغ (ف۔ مونث) تلوار

جوں (ہ) حرف تشبیہ، جیسے، مانند

حتّیٰ (ع) اس قدر۔ جب تک

حُسن (ع۔ مذکر) خوبی۔ عمدگی

خالق (ع) اللہ کا صفاتی نام۔ پیدا کرنے والا

خطبہ خواں (ع۔ مذکر) وعظ و نصیحت کرنے والا۔ نماز میں تقریر یا خطبہ پڑھنے والا

دل پذیر۔ مرغوب۔ پسند خاطر

ریاضت (ع۔ مونث) محنت۔ نفس کشی

زردار (ف۔ مذکر) دولت مند

زرِ برق (ف) شان و شوکت والا۔ آراستہ۔ پیراستہ

زہد (ع۔ مذکر) پرہیزگاری۔ تقویٰ

صید (ع۔ مذکر) شکار

غرب (ع۔ مذکر) مغرب

غوث (ع۔ مذکر) اہل اسلام میں ولایت
کا ایک درجہ

فرق (ع۔ مذکر) فاصلہ۔ جدائی۔ اختلاف

قبیح (ع۔ مذکر) عیب۔ خرابی نقص

قطب (ع۔ مذکر) وہ ولی جس کے سپرد
کسی بستی یا علاقہ کا انتظام ہو۔

کار (ہ۔ مذکر) کام

کفر (ع۔ مذکر) ناشکری۔ بے ای۔ رضو

کشف (ع۔ مذکر) کھولنا الہام۔ القا

کمخواب (ف۔ مونث) ایک ریشمی کپڑا

گدا (ف۔ مذکر) فقیر۔ بھکاری۔ منگتا

مرید (ع۔ مذکر) ارادہ کرنے والا۔ مطیع
شاگرد

مفلس (ع۔ مونث) کنگال۔ غریب

مکر (ع۔ مذکر) دھوکا۔ عیاری۔

منکر (ع۔ مذکر) انکاری۔ کافر۔ بے دین

نار (ع۔ مونث) دوزخ

نوا۔ آواز۔ موسیقی کے ۱۲ مقامات میں
ایک مقام

نور (ع۔ مذکر) روشنی

و (ع۔ ف) اور

وارے۔ فائدہ۔ افاقہ

ولی (ع۔ مذکر) سرپرست۔ مربی
ایسا انسان جو خدا کے قریب ہو۔

مسدس مدّوجزر اسلام

آبی (ف) پانی میں رہنے والا

آبرو (ف) عزت۔ قدر و منزلت۔ ناموری

ارسطو۔ یونان کا مشہور فلسفی۔ سکندر
کا استاد۔ مشیر

ارکان (ع۔ مذکر) رکن کی جمع۔ ستون

آشکارا۔ نمایاں۔ واضح

اطاعت (ع۔ مونث) بندگی۔ فرماں برداری

اعزاز (ع۔ مذکر) عزت۔ رتبہ

اعظم (ع) بڑا

اغنیا (ع۔ مذکر) غنی کی جمع۔ دولتمند لوگ۔
افشاں (ف۔ مونث) چاندی سونے کا برادہ
اقبال (ع۔ مذکر) زمانے کے موافق ہونا۔
آلِ غالب (ع۔ مونث) اولاد۔ کنبہ
امّی (ع) بلا پڑھا لکھا۔ ناخواندہ
اندیش (ف) فارسی مصدر اندیشیدن کا اسم
فاعل سوچنے والا
انشار (ع۔ مذکر) طرز۔ تحریر کوئی بات
پیدا کرنا۔ خط کتابت کے قواعد و اصول
کی کتاب
اولو العلم۔ صاحبِ علم
اہل دین۔ دیندار لوگ۔
اہل مکہ۔ مکّہ کے لوگ
بد اندیش۔ برا چاہنے والا۔ مخالف
برتر۔ بہتر۔ افضل
بربر۔ ایک قوم یا ایک ملک۔ ایک علاقہ
بحر و بر۔ زمین و پانی
برّ اعظم۔ خشکی وہ حصہ جسمیں بہت سے ملک ہوں
بطحا (ع۔ مذکر) فراخ اور کشادہ زمین مراد مکّہ معظ

بہبود (ف۔ مونث) نفع۔ فائدہ۔ بھلائی
بے حرمتی۔ بے عزّتی۔ حرمت کا لحاظ نہ کرنا
پرسش (ف۔ مونث) پوچھنا۔ خیر و خبر لینا
پستی (ف) کمینگی۔ نچائی
پنہاں (ف) چھپا ہوا۔ پوشیدہ
تسلط (ع۔ مذکر) حکومت قائم کرنا
تعیش (ع۔ مذکر) عیش کرنا۔ سامان عیش
مہیا کرنا
تمغہ۔ مہر سلطانی۔ انعامی نشان
تواضع (ع۔ مذکر) خاطر مدارات۔ مہمان نوازی
توحید (ع۔ مونث) خدا کے ایک ہونے پر
یقین کرنا
ثابت قدم۔ مستقل مزاج۔ عہد کا پکا۔ باحوصلہ
ثروت۔ (ع۔ مونث) تونگری۔ حکومت۔ رسوخ
نتیجہ حاصل ثمر (ع۔ مذکر) پھل۔ میوہ
جبل (ع۔ مذکر) پہاڑ
جہت (ع۔ مونث) سمت۔ طرف
جہل (ع۔ مذکر) جہالت۔ کم فہمی
چشم (ف۔ مونث) آنکھ

حاجت (ع۔ مونث) آرزو۔ ضرورت
حذر (ع۔ مذکر) انکار۔ احتیاط۔ بچاؤ
حرا ۔ مقام۔ جگہ
حرص (ع) لالچ
حرفت (ع۔ مونث) پیشہ۔ کاریگری۔ ہُنر
حق (ع۔ مذکر) سچ۔ لائق۔ واجب
حکمت۔ دانائی۔ عقل۔ طبابت
حمیّت (ع۔ مونث) غیرت۔ شرم
خاکی (ف) مٹیالا۔ خاک کی پیدائش
خام (ف) کچّا۔ کمزور
خلق (ع) مخلوق۔ دنیا کے لوگ
خودی (ف۔ مونث) عزت نفس۔ خودشناسی
معرفت نفس
خوان (ف۔ مذکر) دسترخوان۔ طباق۔ تھالی
خواب گراں (ف۔ مذکر) نیند۔ وہم۔ بشکل نیند
خمار (ف۔ مونث) اہم
خیرالامم۔ مراد۔ رسول کریم ص
داور (ع) اللہ تعالیٰ
دائم (ع) ہمیشہ۔ سدا
درگزر (ف۔ مونث) معافی۔ چشم پوشی
دُرافشاں (ف۔ مونث) موتی بکھیرنے
والا۔ خوش بیان
دشت (ف) جنگل
دمِ نزع (ف۔ مذکر) موت کا وقت۔
دم نکلنے کا وقت
ذات واحد۔ اکیلی ذات۔ مراد خدا
راحت (ع۔ مونث) آرام
رحمت (ع۔ مونث) کرم۔ مہربانی
رغبت (ع۔ مونث) خواہش۔ رجحان۔ شوق
رفاقت (ع۔ مونث) دوستی
رفتنی (ف) جانے کے قابل۔ کھویا ہوا
گیا ہوا۔ گزرا ہوا
روا (ف) جائز۔ مناسب
رہبر (ف) راستہ دکھانے والا۔ لیڈر
رہزن (ف) ڈاکو
زن (ف۔ مونث) عورت
زبر (ف) اوپر۔ بلند۔ حاوی۔ بھاری
زر (ف) سونا

زیر (ف۔ مذکر) نیچے۔ کمزور۔ پست
زیب (ف۔ مونث) زینت۔ آرائش
ستم (ف۔ مذکر) ظلم۔ جور
سرفراز (ف) بلند۔ باعزت
سو (ف) بہرصورت۔ ہرچند
سیم (ف۔ مونث) چاندی
شریعت (ع) مذہبی قانون۔ طریقہ
شش جہت (ف) چھ طرف۔ چھ سمت
شفقت (ع۔ مونث) مہربانی۔ لطف
شہادت (ع۔ مونث) گواہی۔ راہ خدا میں
شہید ہونا۔ حق کے لیے جان دینا
شیر و شکر (ف) ملاپ۔ محبت۔ دودھ چینی
صادق (ع) محبّت۔ ایک جان دقالب
سچائی کا پابند
صافی (ف) رومال کا ٹکڑا
صوت (ع۔ مونث) آواز
صوفی (ع۔ مذکر) پارسا۔ اونی کپڑا پہننے والا پارسا
عار (ع۔ مونث) شرم۔ غیرت
عجم (ع۔ مذکر) ایران

عداوت (ع۔ مونث) دشمنی
عروج (ع۔ مذکر) ترقی۔ مرتبہ
عظمت (ع۔ مونث) بڑائی
عقبیٰ (ع۔ مونث) آخرت
عقوبت (ع۔ مونث) دکھ۔ عذاب۔ سزا
علامت (ع۔ مونث) نشان۔ اشارہ۔ آثار
غضب (ع۔ مذکر) قہر۔ غصّہ
غنی (ع) امیر
غیبت (ع۔ مونث) بدگوئی۔ بدی۔ کسی کی غیر
موجودگی میں برائی کرنا
فاران۔ ایک ملک
فخر (ع۔ مذکر) غرور۔ ناز۔ شیخی
فرمان (ف۔ مذکر) حکم
فصیح (ف) خوش بیان۔ شیریں کلام
فقیر (ع۔ مذکر) درویش۔ بھکاری
فلاطون (ع۔ مذکر) افلاطون۔ یونان کا
فلاسفر۔ دانا
فنا (ع۔ مذکر) ہلاک۔ موت
اصطلاح تصوف میں حدوث اور قدم کے فرق کا دو

فنون (ع۔ مذکر) فن کی جمع

قبائل (ع۔ مذکر) قبیلہ کی جمع

قرون (ع۔ مذکر) زمانہ۔ زمانے کی جمع

قریہ (ع۔ مذکر) گاؤں

کاذب (ع) جھوٹا

کایا (ہ) جسم۔ روپ۔ بھیس۔ اصلیت

کندن (ہ) سونا، خالص

کوہ صفا۔ صفا کا پہاڑ۔ صفا اور مروہ۔ مکّہ معظمہ کے نزدیک دو پاک پہاڑیاں

کیمیا (ع۔ مونث) اکسیر۔ تیر بہدف علم سائنس۔

لقب (ع۔ مذکر) مدح یا ذم کے باعث پڑ جانے والا نام

مُبرّا (ع) پاک۔ بے عیب

مُبصّر (ع) پڑھنے والا۔ لکھنے والا۔ اصطلاح تنقید میں وہ شخص جو کسی کتاب یا فن پارے پر رائے دیتا ہے

مدار (ع) انحصار۔

مراد (ع۔ مونث) مطلب۔ مقصد۔ مدعا۔ مفہوم

ماویٰ۔ جائے پناہ۔ گھر۔ ٹھکانہ

محدّث۔ علم حدیث کا جاننے والا

مرجع خلق (ع۔ مذکر) وہ شخص بے ٹھکانہ جہاں دوسرا رجوع ہو

مَس (ع۔ مذکر) چھونے کا فعل۔ رغبت

مسخ (ع۔ مذکر، مونث) اچھی شکل سے خراب شکل ہو جانا۔ بدل جانا

مصاحب (ع۔ مذکر) ہم نشیں۔ خاص دوست

مُصفّا (ع) صاف کرنے والا

مفلوک (ع) کمزور۔ مفلس۔ تباہ حال

مفاسد (ع) فساد پھیلانا

مُفسّر (ع) تفسیر بیان کرنے والا۔ شارح

مطیع (ع) غلام۔ اطاعت کرنے والا

مطلق (ع) آزاد۔ بالکل

ملجا (ع۔ مذکر) امن کی جگہ۔ وہ مقام جہاں امان ملے

ممتاز (ع) بڑا۔ اعلیٰ۔ افضل

منبر (ع۔ مذکر) تقریر کرنے یا خطبہ پڑھنے کی جگہ

موجزن۔ ٹھاٹھیں مارنے والا۔ ابال

مولیٰ (ف۔ مذکر) اللہ۔ مالک۔ آقا

میزان (ع۔ مونث) تولنا۔ ترازو۔ آسمان کا ساتواں برج

مے۔ شراب

نخوت (ع۔ مونث) غرور

نسخہ (ع۔ مذکر) ترکیب۔ ڈھنگ۔ صلاح وہ تحریر جو طبیب لکھتا ہے

نوعِ انساں (ع۔ مذکر) بنی آدم۔ انسان

نہاں۔ چھپا ہوا

والی (ع۔ مذکر) مالک۔ سرپرست

ودیعت (ع۔ مذکر) امانت۔ سپردگی

وراثت (ع۔ مذکر) میراث۔ ترکہ

ہادی (ع۔ مذکر) ہدایت کرنے والا۔ رہنما

ہمسایہ۔ پڑوسی

ہوا و ہوس۔ لالچ۔ خواہش۔ طلب دنیا۔ حرص۔ عیاشی

شعاعِ امید

آشوب (ف۔ مذکر) فساد۔ پریشانی

آغوش (ف۔ مذکر۔ مونث) گود۔ بغل

آفاق (ع۔ مذکر) افق کی جمع۔ آسمان کے کنارے

افرنگ۔ غیر وطن۔ عیسائی

اقبال (ع۔ مذکر) زمانے کے موافق ہونا۔ اقرار

ایام (ع۔ مذکر) یوم کی جمع۔ دن۔ زمانہ

بام (ف۔ مونث) چھت سانپ کی شکل کی ایک مچھلی

بحر (ع۔ مذکر)

بیگانہ (ف) غیر۔ ناآشنا

پایاب۔ بحر۔ سمندر۔ حصول۔ کچھ حاصل کرنا

پروین (ف۔ مذکر) سات ستاروں کا جھرمٹ

پہنائی (ف۔ مونث) گہرائی

تجلی (ع۔ مونث) روشنی۔ جلال۔ جلوہ

تنویر (ع۔ مونث) روشنی۔ نور۔

چمک

جوہر (ع۔ مذکر) قیمتی پتھر عطر۔ وہ چیز جو بذات خود قائم ہو۔ ایٹم۔ تلوار۔ ہنر کمال۔ آئینے کی تاب وغیرہ وغیرہ۔ لڑتے لڑتے مارے جانا۔

چمنستاں (ف۔ مذکر) گلزار۔ باغ

حذر (ع۔ مذکر) انکار۔ احتیاط۔ بچاؤ

حرارت (ع۔ مونث) گرمی۔ جوش

خاور (ف۔ مذکر) سورج

حذف (ع۔ مذکر) الگ کرنا نکالنا۔ ہٹانا

خورشید (ف۔ مذکر) سورج

در (ف۔ مذکر) دروازہ

دُر (ع۔ مذکر) موتی

راحت (ع۔ مونث) آرام

ساز (ف۔ مذکر) باجہ

سیراب (ف) پانی سے بھرا ہوا۔ تر و تازہ۔ تشفی۔

سیہ (ف) کالا

سیماب (ع۔ مذکر) پارہ

شعاع (ع۔ مذکر) کرن

صبا (ع۔ مونث) ہوا جو مشرق کی طرف سے چلے

صفت (ع۔ مونث) خوبی

طوف (ع۔ مذکر) چکر۔ گردش

عالم لاہوت۔ ذات الٰہی کا مقام جہاں سالک کو فنا فی اللہ ہونا ہوتا ہے۔

عطا (ع۔ مونث) انعام۔ بخشش

غوّاص (ع۔ مذکر) غوطہ خور۔ تیراک

فراموش (ف۔ مونث) بھولا ہوا۔ یاد سے اترا ہوا

فضا (ع۔ مونث) زمین کی کشادگی۔ نکلا ہوا۔ رونق

فطرت (ع۔ مونث) نیچر عقل۔ قدرت

کدہ (ف۔ مذکر) مقام۔ گھر

لالہ (ف۔ مذکر) سرخ پھول جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔

مضراب (ع۔ مونث) ستار بجانے کا چھلّا

خاکِ ہند

آبیاری ۔ پانی دینا۔ سینچنا
اجل (ع۔ م) موت
ازل (ع۔ مونث) وہ زمانہ جس کی کوئی
ابتداء نہ ہو۔ آغاز ابتداء
افردگی (ع۔ مونث) دکھ۔ کمھلاہٹ۔ پھیکاپن
چہرہ اُترا ہوا
الفت (ع۔ مونث) دوستی
اکبر (ع) بڑا
انجمن (ف۔ مونث) محفل
اوج (ع۔ مونث) بلندی۔ عروج۔ ترقی
برگ گل (ف) پھول کے پتّے۔ پنکھڑیاں
برہم (ف) ناراضگی۔ بے ترتیب۔ انتشار
بندہ (ت۔ مذکر) نیاز مند۔ خاکسار۔ غلام
بوستان (ف۔ مذکر) باغ۔ شیخ سعدی کی
کتاب نظم
بیکس ۔ مجبور۔ ساتھی کے بغیر۔ محتاج

پستی (ف۔ مونث) نیچائی۔ زوال
تاباں (ف) روشن۔ نورانی
جام (ف۔ انگ۔ مذکر) گلاس۔ ساغر۔ پیالہ
جبیں (ع۔ مونث) پیشانی
جلوہ (ع۔ مونث) سامنے آنا۔ ابرار۔ نور
جوئے شیر (ف) دودھ کی نہر۔ وہ نہر جو فرہاد
نے شیریں کے لیے کھودی تھی۔
حُبِّ وطن (ع۔ مونث) وطن دوست
حُبِ قومی ۔ قوم کا دوست
خلعت (ع۔ مذکر) لباس
خمار (ع۔ مذکر) نشہ
دانش (ف۔ مونث) عقل۔ فہم
در (ف۔ مذکر) دروازہ
رانا (ہ۔ مذکر) چھوٹا راجہ ٹھاکر
راجپوتوں کا خطاب
رشک (ف۔ مذکر) غیرت
زیب (ف۔ مونث) آراستگی۔ سجاوٹ
زینت (ع۔ مذکر) زیتون کا تیل

سحر (ع۔ مونث) صبح۔ فجر۔ تڑکا
سرمد (ع) ہمیشہ قائم رہنے والا۔ دائم۔ غیرفانی ۔ حضرت سرمدؔ
سرو (ف۔ مذکر) ایک مشہور درخت جو سیدھا مخروطی شکل کا ہوتا ہے۔
سمن (ف۔ مونث) چنبیلی۔ یاسمین
سوربیر (ہ) بہادر
شوکت (ع۔ مونث) اعزاز۔ مرتبہ
شیدا (ف) عاشق۔ فریفتہ۔ فدا
صور (ع۔ مذکر) نفیری۔ قرنا
ضیا (ع۔ مونث) روشنی۔ چمک
طاری (ع) ناگہاں ظاہر ہونے والا۔ چھا جانے والا۔ غالب آنے والا
طاؤس (ع۔ مذکر) مور۔ ایک ساز جو مور کی طرح ہوتا ہے
طرب (ع۔ مونث) خوشی۔ شادمانی۔ انبساط
عزّوشاں (ع۔ مونث) شرف۔ عزّت بزرگی۔ عزت و مرتبہ
عظمت (ع۔ مونث) بڑائی

عیاں (ع) ظاہر
غبار (ع۔ مذکر) دھول۔ گرد
فردوس (ع۔ مذکر) جنت
فغاں (ف۔ مذکر) گریہ۔ رونا
فیض (ع۔ مذکر) دوسرے سے فائدہ لینا نیکی۔ بھلائی
کہن (ف) پرانا
کیفیت (ع۔ مونث) حالت۔ ڈھنگ۔ لطف
گوش (ف) کان۔ کنارہ
گوتم (س۔ مذکر) بدھ مذہب کا بانی ساکی منی۔ ایک رشی کا نام جس سے ایک شاستر منسوب ہے۔
لہو (ہ۔ مذکر) لوہو کا مخفّف۔ خون
معبد (ع۔ مذکر) عبادت گاہ
ناقوس (ع۔ مذکر) سنکھ ہندو عبادت کے وقت بجاتے ہیں
وادی (ع۔ مونث) گھاٹی۔ دو پہاڑوں کے بیچ کی زمین

کسان

آثار (ع۔ مذکر) اثر کی جمع نشانات علامات

اِدّعا (ع۔ مذکر) دعویٰ کرنا۔ بے دلیل بات کہنا۔ ایسی بات کرنا جو واقعی نہ ہو

ارتقار (ع) اوپر چڑھنا۔ بتدریج ترقی کرنا

ارض وسما (ع) زمین و آسمان

استقلال (ع۔ مذکر) قیام مضبوطی

اسرار (ع۔ مذکر) سر کی جمع۔ بھید۔ پوشیدہ باتیں

اضطراب (ع۔ مذکر) بے قراری۔ بے چینی

افشاں (ف۔ مونث) چاندی سونے کا برادہ

آفریں (ف۔ مذکر) شاباش۔ کلمۂ تحسین۔ مبارک۔ باد۔ واہ واہ۔ مرحبا

آفتاب (ف۔ مذکر) سورج۔ دھوپ۔ شراب کا پیالہ گنجیفہ ادر تاش کے ایک سر کا نام

امیر (ع) حاکم مالدار

آہن (ف۔ مذکر) لوہا

آئین (ف۔ مذکر) دستور العمل۔ قانون۔ ضابطہ ملک کا بنیادی قانون

باراں (ف۔ مذکر) مینہہ۔ بارش

باریاب۔ داخل ہونا۔ حاضر ہونا۔

بام (ہ۔ مونث) سانپ کی شکل کی ایک مچھلی

بانی (ع۔ مذکر) بنیاد رکھنے والا۔ موجد۔ مفسد۔ فسادی

باہمی (ف) آپس کا۔ ساتھ کا

بزم (ف۔ مونث) محفل۔ مجلس

بوستاں (ف۔ مذکر) باغ

بیم (ف۔ مذکر) خوف۔ خطر۔ اندیشہ۔ ڈر

پارہ (ف۔ مذکر) پارچہ۔ ٹکڑا۔ پرزہ۔ قاش پتھر کی چھوٹی سی دیوار

پاسبان۔ رکھوالا۔ نگہبان

پروردگار (ف۔ مذکر) پالنے والا۔ مالک۔ اللہ۔

پیشوا (ف۔ مذکر) رہنما۔ امام۔ مرہٹوں کا لقب

پیہم (ف۔ مذکر) لگاتار۔ متواتر

تابش (ف۔ مونث) حرارت۔ دھوپ کی چمک روشنی

تابانی (ف) روشن۔ نورانی

تاجدار (ع) بادشاہ

تاک (ف) انگور کی بیل

تخریب (ع۔ مونث) خراب کرنا۔ اجاڑنا

تلخی (ف۔ مونث) کڑواہٹ ترشی۔ تیزی

تیرگی (ف۔ مونث) اندھیرا۔ کدورت

تیغ (ف۔ مونث) شمشیر۔ تلوار۔ خنجر

جاں کاہ (ف) جان گھلانے والا۔ جاں گداز عموماً کسی سخت واقعہ یا حادثہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

چرخ (ف۔ مذکر) پھرنے والا پہیہ۔ آسمان فلک

چشم و چراغ (ف۔ مذکر) روشنیٔ چشم۔ نورِ چشم آنکھ کی پتلی۔ نہایت عزیز پیاری اولاد

حامی (ع۔ مذکر) حمایتی۔ مددگار۔ نگہبان

حرماں (ع۔ مذکر) ناامیدی۔ مایوسی۔ بدقسمتی

خار و خس (ف۔ مذکر) کوڑا۔ کرکٹ

خنکی (ف۔ مونث) سردی۔ ٹھنڈک

خو (ف۔ مونث) خصلت۔ عادت

خورشید (ف۔ مذکر) سورج۔ آفتاب

خوں چکاں (ف۔ مذکر) لہو ٹپکتا ہوا

درخشاں (ف) روشن۔ چمکدار۔ چمکیلا

دریوزہ (مذکر) بھیک گدائی

دشت (ف۔ مذکر) جنگل۔ بیابان۔ صحرا۔ میدان

دہقان (ف۔ مذکر) مالک۔ کسان

دود (ف۔ مذکر) دھنواں۔ بھاپ

دہن (ف۔ مذکر) دہان کا مخفف۔ منہ۔ مکھ

ردا (ف۔ مونث) چادر۔ چُغہ

رفیق (ع۔ مذکر) ساتھی۔ ہمسفر۔ مددگار۔ دوست۔ خیرخواہ۔ جلیس

رقیق (ع۔ مذکر) باریک۔ نرم۔ ملائم

زرافشاں۔ سونے کا

ستم (ف۔ مذکر) جور۔ ظلم۔ تکلیف

سخت کوشی۔ سختی کھینچنے والا۔ مشکل

سرنگوں ۔ شکستہ ۔ ہارا ہوا
سرمایہ (ف مذکر) زر ۔ اصل ۔ پونجی ۔ راس المال
سُرور (ف ۔ مذکر) شادی ۔ خوشی ۔ کیف ۔ خمار
سماء (مذکر) آسمان ۔ فلک
سوگوار ۔ف ۔ غمگین ۔ مغموم
سیم وزر ۔ سونا ۔ چاندی
سیل (غ ۔ مذکر و مونث) پانی کا سیلاب
بہاؤ ۔ طغیانی

ناظر (ع ۔ مذکر) دیکھنے والا
ناظم (ع) پرونے والا ۔ منتظم ۔ شاعر ۔ نظم لکھنے والا
نظام (ع ۔ مذکر) جوڑ ۔ بنیاد ۔ سلسلہ
انتظام ۔ روش
وارث (ع ۔ مذکر) ورثہ کا حقدار
وسعت (ع ۔ مونث) گنجائش ۔ پھیلاؤ
کشادگی
ہجوم (ع ۔ مذکر) بھیڑ بھاڑ ۔ مجمع ۔

نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی کا نام ولی محمد اور والد کا نام محمد فاروق تھا۔ والدہ نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ کی بیٹی تھیں۔ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ء کو بہ مقام دہلی زمانۂ محمد شاہ ثانی عرف محمد شاہ رنگیلے پیدا ہوئے۔ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ کی قتل و غارت گری نے دلی کو تباہ و تاراج کیا۔ اس کی شیطنت اور حیوانیت نے کتنے بچوں کو یتیم اور کتنی ماؤں کو بیوگی کا درد دیا۔ پھر احمد شاہ ابدالی کی ہوس جہانگیری نے سسکتی دہلی کا دم گھونٹ دیا اس بد بخت اور کمین فطرت نے ۱۷۴۸ء، ۱۷۵۱ء اور ۱۷۵۶ء کو متواتر حملوں سے خلق خدا کو تنگ کیا۔ کیا کیا نہ ستم توڑا۔ کیسا کیسا رقص ابلیس کیا۔ اور ایسی ظلم و ستم کاری کی روایت قائم کی جس کا لہو آج بھی تازہ ہے۔ دلّی والوں کا عرصۂ حیات تنگ ہوا جس کو جدھر تقدیر لے گئی وہ وطن سے نکل گیا۔ بچپن دلّی ہی گزرا۔ ابدالی حملے کے بعد ۲۲ یا ۲۳ سال کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ساتھ اکبر آباد کی طرف مراجعت کی اور نانہال کو ہی اپنی ملجا و ماوی بنا لیا۔ اقامت زیادہ تر نوری دروازہ اور تاج گنج میں رہی۔ شادی تہوار النساء بیگم بنت محمد رحمان اور نواسی عبدالرحمٰن خاں چغتائی سے ہوئی۔ اولاد میں ایک بیٹا گلزار علی اور ایک بیٹی امامی بیگم ہوئی۔ عمر طویل پائی۔ ۱۸۳۰ء میں انتقال ہوا۔ ذریعہ معاش معلّمی تھا۔

لالہ بلاس رام کے بچوں کے اتالیق تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کے قد و قامت اور خد و خال کے تعلق سے یہ تصویر بنائی

"رنگ ان کا گندم گوں، قد میانہ، پیشانی اونچی اور چوڑی، آنکھیں چمک دار، ڈاڑھی خشخاشی اور مونچھیں بڑی رکھتے تھے۔ کھڑکی دار پگڑی، کاڑھے کا انگرکھا، سیدھا پردہ، نیچی چولی، اس کے نیچے کرتا، ایک بر کا پائجامہ، گھیتلی جوتی، ہاتھ میں شام دار چھڑی، انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔۔۔۔"

عموماً ان کی جو تصویر کتابوں میں چھپی ملتی ہے اس میں نہ تو پگڑی اور نہ خشخاشی ڈاڑھی۔

ان کی کتابوں میں ایک کلیات، دو دیوان اردو، ایک دیوان فارسی نظم میں، نثر فارسی میں ۹ کتابیں قدر متین، بزم عشق، رعنائے زیبا وغیرہ یادگار ہیں۔

کلیات پہلی بار مطبع الٰہی واقع کنبوہ دروازہ (آگرہ) میں چھپا تھا۔ پھر طبع دوم ۱۸۸۲ء مطبع احمدی واقع چارسو دروازہ (آگرہ) میں شائع ہوا۔ پھر تیسرا تبدیل شدہ اڈیشن منشی نول کشور جی نے اپنے پریس میں سے بعض فحش اور گندے اشعار و نظم حذف کر کے شائع کیا۔ ۱۹۱۱ء میں پروفیسر شہباز نے نئی ترتیب کے ساتھ کلیات مرتب کیا جسے نول کشور پریس نے شائع کیا۔ نظیر کا کلیات یا دیوان کئی لوگوں نے الگ الگ مطابع سے شائع کیا۔ نول کشور کلیات کی پہلی اشاعت ماہ جولائی ۱۸۸۸ء کو کانپور سے ہوئی۔ پھر دوسرا اڈیشن ۱۸۹۳ء کو لکھنؤ سے شائع کیا۔ اس میں بے شمار کتابت کی غلطیاں ہیں جس کی طرف محمود اکبرآبادی نے اپنی کتاب روحِ نظر کے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔

" افسوس کہ چھاپنے والوں نے ذرا صحت کا خیال نہیں کیا۔ جیسا ہاتھ لگا غلط سلط چھاپ ڈالا۔"

۔۔۔ (ص ۶۵)

صوفی مشرب مولانا فخرؔ دہلوی کے بموجب نظیرؔ نے ۲۲ رصفر ۱۲۴۶ھ مطابق یکم اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال کیا۔ ایک شاگرد نے تاریخ وفات کہی۔

"مخمّس بے سر و پا، بیت بے دل، فرد بے سر شُد"

نظیرؔ کے کام و انصرام کے تعلق سے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں گلزارِ نظیرؔ / سلیم جعفر، زندگانی بے نظیر / پروفیسر شہباز۔ روح نظیر / مخمور اکبرآبادی۔ دیوان نظیر / مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، اشعار نظیر / حافظ شمس الدین احمد منیری۔ نظیر اکبرآبادی / ڈاکٹر محمد حسن۔ نظیر اکبرآبادی / ڈاکٹر شمس الحق عثمانی قابل ذکر ہیں۔

● ●

خواجہ الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی بن خواجہ ایزد بخش بہ مقام پانی پت ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پدری سلسلہ خواجہ ملک علی سے ملتا ہے۔ حالی نے غربت و ناداری کی آغوش میں پرورش پائی۔ ۹ سال کی عمر میں یتیمی کا صدمہ برداشت کیا۔ تعلیم و تربیت کا بار بے اولاد بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے اٹھایا۔ سید جعفر علی سے فارسی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ۱۷ برس کی عمر میں بغیر رضا و رغبت شادی کر دی گئی مگر "شوق علم کی یہ کیفیت تھی کہ شادی زنجیر پا نہ بن سکی"۔ پر اسرار خاموشی کی نقاب ڈالی۔ دلی کی راہ لی۔ مولوی نوازش علی کے مدرسہ میں پناہ لی۔ منطق و عروض اور ادب عربی میں مہارت حاصل کی۔ غالب سے حصول فیض کا موقع ملا۔ جب ڈیڑھ سال کی روپوشی بے نقاب ہوئی تو امداد حسین کے حکم کی تعمیل کی۔ "بے چوں و چرا ساتھ ہو لئے، مفاہمت کرتے ہی بنی، گھاٹے پر صلح کر لی" گھر کی ذمہ داریاں قبول کیں۔ ۱۸۶۵ء میں کلکٹری حصار میں ملازمت کی مگر ۱۸۵۷ء کے نام کا انقلاب نے کروٹ لی۔ وطن واپس آئے۔ ۳، ۴ سال بعد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کی ایما پر ان کے لڑکوں کی معلمی کی۔ آٹھ سال تک شیفتہ کی باغ و بہار صحبت سے لطف اٹھایا۔ ذوق شعر گوئی کو جلا بخشی۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میرؔ کا

نواب صاحب کی وفات کے بعد لاہور آئے۔ گورنمنٹ بک ڈپو کے شعبۂ ٹیکسٹ بک کمیٹی کی ملازمت کی۔ "انگریزی ادب اور مغربی خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملا"۔ ہالرائڈ کی محبت اور آزاد کی رقابت کا بوجھ اٹھایا۔ "آزاد، حالی سے جلتے تھے اور کھلم کھلا ان کی مخالفت کرتے تھے"۔ حالیؔ باغی تھے فرسودہ روایت کے، ادب و شعر کے مردہ خیالات کے، برکھارات، نشاط امید، مناظرۂ رحم و انصاف، حب وطن اسی دور کی یادگار ہیں۔

آٹھ ماہ تک لاہور کے چیفس کالج میں فریضۂ تدریس کی ادائیگی کے بعد دلّی آئے اور اینگلو عربک کالج میں بطور مدرس ملازمت کی۔

سرسید کی ایما پر "مدوجزر اسلام" جیسا مشہور مسدس لکھا جو اُن کے پورے ذہن کا آئینہ ہے"۔ انھوں نے جو مرثیے بھی لکھے وہ بھی ادب رثائیہ میں اضافہ ہیں۔

۱۸۸۷ء میں سرسید کی وساطت سے سرآسمان جاہ سے ملاقات کی۔ ۷۵ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ سرکار نظام سے حاصل کیا اور ڈپوٹیشن پر حیدرآباد جانا ہوا تو وظیفہ سو۱۰۰ روپیہ ماہوار ہو گیا۔ مگر چند سال بعد ہی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن واپس لوٹ کر تصنیف و تالیف کا شغلۂ نفیس اختیار کیا۔ ۱۹۰۴ء میں علمی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔

عمر کا آخری حصّہ نانوخان اور عطاء اللہ کے رحم و کرم پر گذارا۔ ۱۹۱۵ء میں وفات پائی گویا "لنگڑے اور ٹرّے ملازم" سے نجات پائی۔

ان کی شعری و نثری تصانیف میں مدوجزر اسلام، شکوہ ہند۔ کلیات حالیؔ،

مناجات بیوہ، چپ کی داد، مرثیہ حکیم محمود خاں و تباہیٔ دہلی، مجموعۂ نظم حالی، مجموعۂ نظم فارسی ۔ مقدمۂ شعر و شاعری، حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید، مقالات حالی، تریاق مسموم، علم طبقات الارض، مجلس النساء و دیوان حالی وغیرہ مشہور ہوئیں ۔

حالی کی شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں پر (مضامین کے علاوہ) جو کتابیں اور رسائل کے نمبر شائع ہوئے۔ ان میں حالی مرحوم / امین زبیری (۱۹۲۵ء)، تذکرۂ حالی / صادق قریشی (۱۹۳۵ء) ذکر حالی / ناصح زیدی (۱۹۴۹ء) مقالات یوم حالی / ناصح زیدی (۱۹۵۱ء) یاد حالی / شیخ چاند، یادگار حالی / صالحہ عابد حسین، تذکرۂ حالی / ابواللیث صدیقی، حالی کی شاعری / طاہر جمیل (انگریزی) حالی / موہن سنگھ دیوانہ (انگریزی) حالی اور ان کی کاویہ رچنا / شری جوالا پرشاد (ہندی) نقش حالی / احتشام حسین (۱۹۵۶ء)، مطالعہ حالی / ناظر کاکوروی، مثنویات حالی / شجاعت علی سندیلوی، حالی بحیثیت شاعر / شجاعت علی سندیلوی، تحقیقی مطالعۂ حالی / ظہیر احمد صدیقی، حالی کی ایک جھلک / صالحہ عابد حسین، حالی کا سیاسی شعور / معین احسن جذبی، حالی کا نظریہ شاعری / ناظر کاکوروی، مضامین حالی / وحید الدین سلیم، مطالعہ حالی / کنول کرشن بالی (۱۹۸۰ء) حالی مقدمہ اور ہم / وارث علوی (۱۹۸۳ء) اور زمانہ (کانپور ۱۹۳۵ء) جوہر، اردو (۱۹۵۱ء) صحیفہ (۹۷)، اقوال و نقد حالی / محمد حیات خاں سیال (۱۹۸۱ء)، جمنا تٹ (۱۹۸۹ء) مطالعہ حالی (ساحل احمد) (۱۹۹۷ء) وغیرہ کی خصوصی اشاعتیں شامل ہیں ۔

اقبالؔ

ڈاکٹر اقبال بمقام سیال کوٹ بروز جمعہ ۹؍ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام شیخ نور محمد تھا جو سیال کوٹ کے مشہور تاجر تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے ۱۸۸۹ء میں مڈل کا امتحان وظیفہ کے ساتھ پاس کیا اور اسی درس گاہ سے شمس العلماء میر حسن کی رہنمائی میں میٹرک (۱۸۹۳ء) اور ایف۔ اے (۱۸۹۵ء) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے اور وظیفہ حاصل کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ سے ایم۔ اے کیا اور پنجاب بھر میں اوّل آئے۔ ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان بھی پاس کیا۔

ایم۔ اے کی شاندار کامیابی کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و تاریخ اور سیاسیاتِ مدن کے عارضی لکچرر مقرر ہوئے اور پھر ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ نے اقتصادیات اور سیاسیات کے موضوع پر ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی جو ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

۱۹۰۵ء میں فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان کا سفر کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے "ایران کا فلسفہ"

کے موضوع پر مقالہ لکھا جو ۱۹۰۸ء میں لندن سے شائع ہوا۔

جرمنی سے واپسی کے بعد لندن کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ لندن میں اسلام کے موضوع پر کچھ تقریریں کیں اور چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ عربی کے پروفیسر رہے۔

DEVELOPMENT OF METO PHYSICS.

کے موضوع پر ایک کتاب ۱۹۰۸ء میں پیرس میں طبع ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں تاریخ ہند امرتسر سے چھپی۔

ولایت سے واپس آنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے دوبارہ تقرری حاصل کی لیکن آٹھ ماہ کی ملازمت کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو لاہور میں وکالت شروع کی جس کا سلسلہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہا۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء میں حکومت برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے

۱۹۲۸ء میں REONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS OF ISLAM کے موضوع پر لیکچر دینے کی غرض سے مدارس کا سفر کیا۔ ۱۹۲۵ء میں نواب صاحب بھوپال نے ادبی خدمات کے صلے میں پانچسو روپیہ ماہانہ وظیفہ تاحیات مقرر کیا۔

۱۹۲۴ء میں کابل کا سفر اختیار کیا۔ ۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو بنگلور کی مسلم لائبریری کے زیر اہتمام جلسے میں تقریر کی۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو میسور یونیورسٹی میں بھی تقریر کی۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد کا سفر کیا اور وہاں کئی جلسوں میں تقریریں کیں۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت کی۔ ۱۹۳۱ء میں فلسطین میں منعقدہ مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کی۔ ستمبر سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک گول میز کانفرنس

کے سلسلہ میں لندن میں قیام کیا اور وہیں سے ۱۹۳۲ء میں پیرس گئے۔ برگساں سے ملاقات کی۔ ۱۹۳۲ء میں روم میں میسولینی سے ملاقات کی اور واپسی میں اسپین اور مصر کی سیر کی۔ مسجد قرطبہ اسی زمانہ کی مشہور و معروف یادگار ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں نہرو لاہور تشریف لے گئے تو ان سے ملاقات کی اور ملک کے سیاسی مسئلوں پر گفتگو کی۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں افغانستان کی سیاحت کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حالی کی برسی پر پانی پت کا سفر کیا۔

زمانۂ آخر میں گھر سے باہر نکلنا موقوف ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء ہی میں گلے کے عارضے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بغرض علاج بھوپال کا سفر کیا۔ اسی درمیان جاوید سردار بیگم ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو انتقال فرما گئیں۔ ۱۹۳۷ء میں موتیابند کی شکایت میں شدت پیدا ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں درد گردہ کی شکایت دوبارہ عود کر آئی۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں قلب بھی کافی کمزور ہو گیا تھا۔ حکیم نابینا کا علاج ہوا مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی رات حالت زیادہ خراب ہوئی اور صبح ہوتے ہوتے یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو نقل مکانی کیا۔

شعری و نثری تصانیف میں بانگ درا (۱۹۲۴) بال جبریل (۱۹۳۵ء) ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) ارمغان حجاز (۱۹۳۸ء) اسرار خودی (۱۹۱۵ء) رموز بے خودی (۱۹۱۸ء) پیام مشرق (۱۹۲۳ء) زبور عجم (۱۹۲۷ء) مسافر (۱۹۲۴ء) فلسفۂ ایران (۱۹۰۸ء) علم الاقتصاد (۱۹۰۳ء) تاریخ ہند (۱۹۱۴ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) پس چہ باید کرد (۱۹۳۶ء) وغیرہ کی اہمیت مسلّم ہے۔

ان کی شاعرانہ اور شخصی بصیرت پر ہزاروں مضامین اور سیکڑوں کتابیں زیور طبع سے

آراستہ ہو چکی ہیں۔ جن میں سے درج ذیل کتابیں "اقبالیات" کے ذخیرہ میں بیش قیمتی اضافہ ہیں۔

فکر اقبال (خلیفہ عبدالحکیم) تصورات اقبال (صلاح الدین احمد) ذکر اقبال (عبدالمجید سالک) نقش اقبال (اسلوب احمد انصاری) روح اقبال (یوسف حسین خاں) اقبال کی تلاش (نظر انصاری) اقبال احوال و افکار (عبادت بریلوی) اقبال مجدد عصر (سہیل بخاری) اقبال اپنے آئینے میں (رئیس احمد جعفری) اقبال! جامعہ کے مصنفین کی نظر میں (گوپی چند نارنگ ـــ) حیات اقبال (طاہر تونسوی) سیرت اقبال (طاہر فاروقی) تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں (وزیر آغا) اقبال ایک مطالعہ (کلیم الدین احمد) اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ (ساحل احمد) اقبال کے کلاسیکی نقوش (نور سدید) متعلقات خطبات اقبال (سید عبداللہ) اقبال کا فکر و فن (فضل حق قریشی) اقبال (خواجہ منظور حسین) اقبال ایک شاعر (سلیم احمد) اقبال اور غزل (ساحل احمد) اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ (ساحل احمد) اقبال کی غزلیں (ساحل احمد) ●●

چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست بہ مقام فیض آباد ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اصلاً کشمیری پنڈت تھے۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی نہیں بنی تھی ڈگریاں الہ آباد یونیورسٹی سے ملتی تھیں۔ اسی لحاظ سے چکبست الہ آباد یونیورسٹی کے گریجوٹ تھے ۱۹۰۸ء میں وکالت کی سند حاصل کی۔ اور وکالت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں رائے بریلی کا سفر کیا۔ لکھنؤ کی واپسی میں فالج کا حملہ ہوا۔ اور وہیں اسٹیشن پر رشتۂ حیات ٹوٹ گیا۔ گیارہ بجے شب میں لاش لکھنؤ پہونچی۔ کاظم حسین محشر لکھنوی نے ان ہی کے ایک مصرعے سے تاریخ وفات نکالی:

ان کے مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

"صبحِ وطن" مجموعۂ کلام ہے ۔ ۹ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا ۔ والد بزرگوار کا نام پنڈت اودت نرائن چکبست تھا ۔ ان کے والد فیض آباد کی سکونت ۱۸۹۱ء میں ترک کی ۔ لکھنؤ آئے ۔ کشمیری محلہ میں رہائش کا انتظام کیا ۔ ۱۸۹۴ء میں جب ان کی عمر صرف ۱۱ برس کی تھی کشمیری کانفرنس میں کئی غزل پڑھی ۔

حُبِّ قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے
بادۂ الفت سے پُر دل کا مرے میخانہ ہے

عمر بہت کم پائی ۔ صرف ۴۳ برس

ڈاکٹر سید اعجاز حسین، آل احمد سرور ۔ عبدالقادر سروری جیسے اساتذہ و دیگر اکابرین نے ان کی شاعری کے بارے میں تعریف کی اور کلام پر تنقیدیں لکھیں ۔

جوشؔ ملیح آبادی

بشیر احمد خاں افغانی النسل شبیرؔ حسن خاں جوشؔ بن بشیرؔ ۱۸۹۴ء کو ملیح آباد کے محلہّ مرزا گنج میں پیدا ہوئے۔ جدِّ اعلیٰ آفریدی یار بیگ نے ۱۸ ویں صدی میں خیبر سے آکر ہندوستان میں رہائش اختیار کی اور صفدر جنگ والیٔ اودھ کی فوج میں معزز عہدہ حاصل کیا۔

جوش کے پردادا فقیر محمد خاں گویاؔ اور نانا محمد احمد خاں دونوں صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا مجموعہ بہ نام "کلام بشیر" شائع ہو چکا ہے۔ جن کی وفات ۱۹۱۶ء میں ملیح آباد میں ہوئی۔ جوشؔ، عزیزؔ کے شاگرد تھے۔ تعلیم ملیح آباد، سیتا پور، لکھنؤ، آگرہ، اور علی گڑھ میں ہوئی۔ ابتدائی درس ملیح آباد میں، پھر آگے کا درس سیتا پور اسکول لکھنؤ سینٹ پیٹرس کالج آگرہ اور علی گڑھ میں لیا۔ جوشؔ کے تین بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ بھائی شفیع احمد خاں کا ۱۹۵۰ء اور بہن افسری بیگم کا ۱۹۲۰ء میں انتقال ہوا۔ فارسی کا درس مرزا رسواؔ، اردو قدرت اللہ بیگ اور انگریزی ماسٹر گومتی پرساد سے پڑھی۔

جوشؔ کی عمر کا بیشتر حصّہ لکھنؤ میں گزرا۔ مگر کسی طور کبھی مستقل مزاجی سے کہیں بھی کسی اسکول یا کالج میں درسیات سے دلچسپی نہیں لی۔ تعلیم سینئر کیمبرج سے آگے نہیں بڑھی۔ تلاش معاش میں کبھی دہلی اور حیدر آباد اور پھر کراچی، اسلام آباد میں قیام کیا۔ پہلا سفر دارالترجمہ حیدر آباد کی ملازمت کے لیے ۱۹۲۵ء میں کیا۔ ۱۹۳۴ء میں حیدر آباد کی سکونت ترک کی اور دوسرا سفر دہلی کو ٹھہرایا۔ جہاں سے کلیم جاری کیا۔

اسی عرصۂ قیام میں چند جرعے، اور پیام کیف جیسی رومانی نظمیں تخلیق کیں۔ نقش ونگار اور شعلہ وشبنم یہیں دہلی سے شائع ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں کلیم کو لے کر ملیح آباد آگئے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک آج کل کی ادارت کی اور پھر یہیں سے نہرو جی کے مسلسل اصرار کے باوجود ۱۹۵۶ء میں پاکستان کی راہ لی۔ جہاں ترقی اردو بورڈ میں بحیثیت منتظم کام کیا اور وہیں ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء اسلام آباد میں نقل مکانی کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

۱۹۴۱ء میں لکھنؤ سے نیا ادب نکالا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں "اردو نامہ" کراچی کی ادارت کی۔ کہتے ہیں ۹ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۲ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۱۴ء میں مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے مشورے سے نظم گوئی کی طرف توجہ کی۔ پہلی نظم ہلال محرم کہی۔ ۱۹۲۰ء میں نظم وغزل کا مجموعہ "روحِ ادب" شائع ہوا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ۱۹۳۸ء میں شاعر انقلاب کا خطاب دیا۔ منشی دیا نرائن نگم نے ۱۹۳۵ء میں شاعر اعظم کے لقب سے یاد کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں (حدِ پاکستان میں داخل ہونے سے قبل) پدم بھوشن خطاب ملا۔ ان کے اگر مجموعہ کلام میں شاعر کی راتیں (۱۹۳۲ء) فکر ونشاط (۱۹۳۷ء) جنوں وحکمت (۱۹۳۶) جوش وخروش (۱۹۴۴ء) حرفِ حکایت (۱۹۳۸ء) آیات ونغمات (۱۹۴۱ء) رامش ورنگ (۱۹۴۵ء) سنبل وسلاسل (۱۹۵۳ء) سموم وصبا، طلوع فکر (۱۹۵۷ء) کی اشاعت عمل میں آئی۔

نثر میں مقالات زریں (۱۹۲۱ء) اوراق سحر (۱۹۱۱ء) اشارات (۱۹۴۰ء) اور یادوں کی برات مستقل تصانیف ہیں۔ حسین اور انقلاب اور موجد ومفکر ان کے دو طویل مسدس کی ساخت میں اشائی نظمیں ہیں۔ طلوع فکر، حضرت علی کی تعریف میں طویل نظم لکھی۔

نظم کا سفر

اردو نظم کے سلسلے سے آزاد نے آبِ حیات میں تفصیلی بحث کی ہے اور اس کی ابتدا کا زمانہ ۱۶۶۷ء قرار دیا ہے اور دلی کو پہلا نظم نگار شاعر کہا ہے۔ اردو نظم اردو شاعری کی وہ قسم ہے جو تسلسل و تفکر کے ارتکازی اوصاف کے باعث بے پناہ وسعت کی حامل صنفِ سخن بن گئی ہے۔ ہیئتی اور موضوعی اعتبار سے اس کا دامنِ شعری بے حد وسیع ہے۔

۱۸ویں صدی کے آغاز میں پہلے پہل صنعتی فروغ نے ایک طبقہ کو کچل کر رکھ دیا تھا جس سے ایک بے چینی اور ناآسودگی پھیل گئی تھی۔ علم و ادب پر بھی اسی انتشار اور بے اطمینانی نے اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ حساس شعراء نے ہم آواز ہو کر تصنع اور کھوکھلے پن کا پردہ فاش کیا اور ایک نئے شعری تفکر کی بنیاد پڑی۔ نئے معیار بنے اور نئی قدروں نے وجودی حیثیت اختیار کی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ایک اور نئے حال وقال نے نئی طرح کی زندگی متشکل کی۔ ہر شعبۂ حیات میں نئی فکری تونگری نے کروٹ لی۔ موضوعات کا تنوع اور سوچ و فکر کا زاویہ ادب کا لازمی جزو قرار دیا گیا۔ انجمن نظم پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں اور مذاکروں میں آزاد و حالی نے نظمیہ فکر کا نیا نقطۂ خیال پیش کیا۔ اس نظمیہ مشاعرے نے نظم کو جو نئے خدوخال عطا کیے وہ اگلی منزل کا نوشتہ بن گئے۔ بقول شاگرد آزاد غلام حیدر ارشاد "۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں ایک عمدہ یادگار سمجھا جائے گا۔ .... شعراء ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ ..... گیارہ ماہ تک مشاعرہ قائم رہا۔ ......"

> " اس میں شبہ نہیں کہ اس مشاعرے نے جدید شاعری کا ایک ماحول پیدا کیا۔ ..... یہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ایک کوشش تھی۔ ..... جس کو نئے حالات نے وقت کی آواز بنا دیا۔"
>
> (عبادت بریلوی)

آزاد اور کرنل ہالرائڈ کی مشترکہ کوششوں اور نئی تبدیلیوں کا حالی نے خیر مقدم کیا اور خود بھی اس میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے لکھا کہ

> " اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کی شاعری جو کہ در دولت عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔"

انجمن کے ان مشاعروں میں مصرعہ طرح کی جگہ نظمیہ عنوانات پر طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی تھی۔ آزاد کی مثنویاں موسوم بہ شب قدر، صبح امید، حب وطن،

حالی کی برکھارت، نشاطِ امید، حُبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ یہ نظمیں نئے شعور کے ترجمان ہی نہیں نئے فکری رویّہ کا اشاریہ بھی ہیں۔ یہ نظمیں مواد و ہیئت کے اعتبار سے بھی منفرد اور نئے اظہارِ بیان کا اعلامیہ قرار پائیں۔ ان مشاعروں میں اقبال نے بھی شرکت کی۔ عصری حالات کے پیشِ نظر زندہ اور متحرک رویّہ کو اولیت دی گئی۔ حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں نئی تبدیلی کے تعلق سے مباحث کے کئی در باز کردیئے ہیں۔ انھوں نے سماجی حقیقت نگاری کو اوّلیت دی جو آگے چل کر مقصدی حیثیت اختیار کر گئی۔

نظم جدید کی جو تحریک آزاد، حالی نے شروع کی تھی وہ اوائل بیسویں صدی تک پورے تموّج پر پہنچ چکی تھی۔ ان نظموں کے ذریعہ سماجی و سیاسی اور انقلاب کی مصوری کی گئی اور پھر یہی تحریک سرسید احمد خاں کے زیرِ اثر زیادہ قوی و توانا بنی۔ جس کے دور رس اثرات نے اردو ادب و شعر کو بہت وقیع و رفیع بنا دیا۔ حالی کی مشہور نظم "مد و جزرِ اسلام" اسی دورِ تحریک کا عمدہ نمونہ ہے۔ حالی نے اپنی بہت سی نظمیں تخلیق کیں جو مشنِ اتحادیہ کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئیں۔ ان کی نظمیں اصلاحی ہوں یا تعلیمی ان سب میں انسانی رشتے کی اہمیت و افادیت موجود ہے۔ سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر قیمتی نظموں کا ذخیرہ بہم ہوگیا۔ حالی، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی اور ظفر علی خاں ظفر وغیرہ نے بیش قیمت نظمیں لکھی ہیں۔ جس میں وقت کی تمازت اور عصری ضرورتوں کی ہمک ملتی ہے۔ ان شعرا کی نظموں میں قومی اور ملّی عناصر کا تفوق نمایاں ہے۔

حالی کے ہم عصروں میں دوسرا اہم نام اکبر کا ہے جو قدامت کے پرستار

ہوتے ہوئے بھی جدید شعری رویّہ کے انکاری نہیں ہیں۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا تھا لیکن پرانی قدروں کو بھول کر نئی قدروں کو اپنالینے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنی وراثت کے محافظ تھے۔ ورثہ کی پاسداری کا عمل ان کی پوری شاعری میں لہو کی مانند رقصاں ہے۔ انھیں اپنی قدریں عزیز تھیں۔ مشرقی شعریات اور تہذیبی اقدار تمام تر حقیقتوں کے باوجود زیادہ عزیز تھیں۔ اسی لیے بعض موقعوں پر انھوں نے سر سید سے برملا اختلاف کیا ہے۔ مغربی تہذیب مشرقیت پر لازم جانا انھیں قبول نہیں تھا۔ ان کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا" اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"[1] انھوں نے زمانے کی نئی روشنی، نئی تعلیم، نئے کلچر اور نئی وضع قطع پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ تنقید بے سبب نہیں تعمیری پہلو رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں نئے زمانے کے نقائص کی نشاندہی کی۔ اس نشاندہی کے لیے علامتوں کا بھی سہارا لیا اور طنزیہ اسلوب کا بھی۔ مس، کالج، شیخ، سید، بسکٹ، انجن، ہوٹل، ریل اور مشین وغیرہ کے ذریعہ نئے کلچر کی مخالفت کی ہے مگر یہ مخالفت بنیادی طور پر تہذیبی ہے۔

قومِ ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے
کالج کے چیونٹے لپٹے ہیں ٹڈی کی ٹانگ سے

—

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ جدید شاعری ص ۱۵

حالیؔ اور اکبرؔ کے ہم عصروں میں شبلیؔ اور اسمٰعیلؔ میرٹھی کے نام سر فہرست ہیں۔ ان میں شبلیؔ نے نظم گوئی کی طرف وہ توجہ نہیں دی جو اسمٰعیلؔ میرٹھی نے دی۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ اور بچّوں کے لیے پُر اثر تعلیمی و اخلاقی نظمیں بھی لکھیں۔ یہ نظمیں ہیئت اور نئے تجربے کی بنا پر اہمیت رکھتی ہیں۔ اب تک کی بیش تر نظموں میں اصلاحی رجحان غالب رہا ہے لیکن اسی کے بین بین ان میں قومی شعور انسان دوستی اور حب الوطنی کے جذبات کی بھی مصوری ملتی ہے۔

بیسویں صدی کا آغاز اردو نظم نگاری میں ایک اور نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس انقلابی آہنگ نے اردو نظم کو نئی کروٹ دی اور نئی آواز سے روشناس کیا۔ دامنِ شعری وسیع ہوا۔ موضوعات میں سماجی تغیرات کی علامت جاگی۔ قومی مسائل کو اوّلیت ملی۔ سیاسی شعور میں پختہ رسی نظر آئی۔ ملکی اور بین الاقوامی مسائل کا ذکر شروع ہوا۔ چکبستؔ، اقبالؔ اور سرورؔ جہان آبادی وغیرہ نے اپنی نظموں میں موضوعی دائرہ بڑھا دیا۔ اور اس نئے رجحان کی پرورش اور توسیع میں حصّہ لیا۔ چکبست کی نظموں میں وطنیت کے جس نئے تصور نے جنم لیا۔ اس نے جذبات کی حدیں توڑ کر اجتماعیت کو زندہ کیا۔ ان کا نظریۂ حیات شخصی نہیں اجتماعی ہے۔ ان کی بیش تر نظمیں حصولِ آزادی کا مصدر نامہ ہیں۔ "ہوم رول" اس کی واضح مثال ہے۔ حُب الوطنی کے جذبہ سے سرشار شعراء میں سرورؔ، افسرؔ اور اقبالؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اقبالؔ کی شعری تونگری اپنی مثال آپ ہے۔ ہمالہ، ترانۂ ہندی، نانک، شعاعِ امید وغیرہ اسی فکری نوشتے کا مثبت اظہار ہیں۔ اقبال اور چکبست

نے اپنی شعری تونگری سے عصری رویّہ کی عکاسی کی اور نظمیہ شاعری کے خزانے میں اضافہ کیا۔ شوق قدوائی، بے نظیر شاہ، علی اختر، تلوک چند محروم، صفی لکھنوی، عظمت اللہ خاں، ساغر نظامی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، اختر صہبائی اور احسان دانش وغیرہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر ایسی نظمیں تخلیق کیں جو ہیئتی اور فنّی اعتبار سے بہت قیمتی ہیں۔ ان میں جذباتی، سماجی، تہذیبی عواملات کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تصویریں نئے رجحان کی عکاس ہیں جنھیں کسی طور پر بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

جوش ان سب میں زیادہ فعال، نمایاں اور منفرد فکر کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری رومان و انقلاب کا امتزاج ہے۔ یہ امتزاج قدر و تہذیب کا بھی ہے اور سیاسی تناسبات کا بھی۔ ان نظموں میں آزادی کی للک اور انقلابی دھمک موجود ہے۔ ان میں موجِ حرکت بھی ہے اور تصادمات کی گرمی بھی۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مشاہدات و تجربات کی ایسی قندیلیں جلائیں جنھیں متخالف ہوائیں بھی بجھا نہیں سکتیں۔ ان میں رومان و حقیقت، واقعیت، ارضیت اور اجتماعیت کی ایسی رمق، ایسا کیف اور ایسا رنگ موجود ہے جو گونگا نہیں، بولتا ہے اور اس بول ابول میں طاقت بھی ہے اور ہمّت بھی۔

صرف ظلمت ہی نہیں ہے دیکھ تنویریں بھی ہیں
کاوشِ تخریب کے ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں

— روشنیاں

وقت اور ماحول کی مناسبت سے شعری فکر راستہ بدلتی ہے۔ زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ جس طرح انسانی زندگی میں اس کی تہذیب و معاشرت

ا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسی طرح زبان و ادب میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ زندہ شاعر ے سامنے سدا سے مختلف مسائل آئے اور اس نے مغربی علوم و نظریات سے استفادہ یا۔ جنگِ عظیم کی ہولناکیاں ختم ہونے پر دنیا نے ایک بھرپور کروٹ لی۔ سیاسیات بیات اور اخلاقیات، ہر شعبۂ زندگی میں نئے نظام کی پرچھائیاں پڑنے لگیں۔ ب میں بھی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحثیں شروع ہوئیں۔

ہویں صدی کا اوائل حصّہ ختم ہوتے ہی ہمارے ملک میں آزادیٔ تحریکوں میں مزید رت پیدا ہوئی۔ سیاسی شعور بالیدہ ہوا۔ جذبات پر یورشیں لگیں اور آزادیٔ یال کو پنپنے کا موقع ملا۔ زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے امکانات وسیع دئے۔ تاریخی اور طبقاتی شعور میں پیش رفتی آئی۔ اور انسانی قدروں کو نئی معیت ملی۔ نئی طاقت و توانائی اور گیرائی ادب میں بھی آئی۔ نئے فکری زاویے ا گر ہوئے۔ وہ ادیب یا شاعر جس کے یہاں وقت کی پکار، زمانہ کا گریہ اور زمانہ اضطراب موجود ہے۔ حقیقتاً وہی زندہ ادیب یا شاعر ہے۔ اختر انصاری ہوی "افادی ادب" میں لکھتے ہیں:۔

> "ہم افادی ادب کے علمبردار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ادب زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے اور اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی ماحول کی عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔"

در اصل ادب ایک سماجی عمل ہے اور ہر سماجی عمل میں انسانی زندگی ر اس کے احساسات سے وابستگی ضرور رہتی ہے۔ وہی سچا ادب ہے جس کا رشتہ

زمین سے ہے۔ زمینی رشتہ ہی ادب کو راستی کے خون سے سینچتا ہے۔ ایسا ہی ادب وقت اور ماحول کا نقیب کہلاتا ہے۔

"کوئی ادب زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہتا۔ یعنی زندگی ادب کا سرچشمہ ہے۔" ۱؎

وقت اور ماحول نے جیسی کروٹ لی شاعر نے بھی تاثر قبول کیا اور ادب کے خد و خال میں نمایاں تبدیلی آئی۔ نئے رنگ و آہنگ اور نئے اسلوب کی بازیافت عمل میں آئی۔ فکری اور حکیمانہ پہلوؤں کے ساتھ مارکسی رویّہ کی بھی چمک پیدا ہوئی۔ تاثیر، فیض، مجاز، جذبی، مخدوم، احمد ندیم قاسمی، ساحر، علی سردار جعفری، اختر انصاری، سلیمان ادیب، جاں نثار اختر، وامق جونپوری، کیفی اعظمی، اور سلام مچھلی شہری وغیرہ نے اپنے اپنے حدود میں زندگی اور مسائلِ زندگی کی ترجمانی کی۔ تاثیر کی ذہانت فیض سے کم نہیں تھی۔ وہ عمر میں بڑے بھی تھے اور ان کی شاعری بھی بڑی تھی لیکن فیض نے زندگی کو دُور سے نہیں قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں زیادہ گہرائی اور اثریت ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں شدتِ احساس، جذباتی تفکر، شعور و آگہی اور زندگی کا بہت واضح نقطۂ نظر ملتا ہے۔ وہ کسی خاص دَور یا گروہ کے شاعر نہیں تھے وہ کسی آدھے ادھورے وقت کے نہیں پورے وقت کے شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہر پل، ہر لمحہ "وقت"

۱؎ اطہر پرویز۔ ادب کا مطالعہ

موجود ہے۔ ان کا وقت محدود نہیں وسیع تر معنوں پر محیط ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری آج بھی اتنی ہی قیمتی ہے، جتنی کل تھی۔

یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

اسی مارکسی فکر کے بین بین ایک دوسری رو بھی موجود تھی جسے پروبال دینے میں بیان یزدانی، نادر کاکوروی، تصدق حسین خالد اور ن م راشد کا شاعرانہ مسلک معاون کار ثابت ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ایک نئے فکری میلان کی بازیافتی کا عمل شروع ہوا۔ اس رویہ یا جدید رجحان کو مزید قوی و توانا بنانے میں میراجی، یوسف ظفر، مختار صدیقی، الطاف مشہدی، مجید امجد، مخمور جالندھری اور ان کے بعد ضیا جالندھری، اختر الایمان، عارف عبدالمتین، منیر نیازی، خلیل الرحمٰن اعظمی، منیب الرحمٰن، قاضی سلیم، وحید اختر اور ان کے بعد کمار پاشی، عمیق حنفی، حمید الماس، بشر نواز، محمد علوی، زبیر رضوی، بلراج کومل، ندا فاضلی، اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے معتبر شعراء کی نظم نگاری نے جدیدیت کو ایک تحریک کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ ان شعراء نے حیات و کائنات، سیار و ثوابت، زمین و خلا، ماضی و حال اور وقت کی تصویر کشی کو نئے علائم و ایمایب استعمال کیا۔ وقت کو داخلی مسئلہ مانتے ہوئے اسے داخلی شعور سے وابستہ کیا۔ نظم کا یہ تاریخی سفر جاری ہے اور آگے بھی جاری رہے گا۔

●●

مطبوعات: اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد

اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	ساحل احمد	/۱۵
یازدہ	"	-/۱۰
اقبال اور غزل	"	-/۱۵
برگ نامہ	"	-/۲۰
چہرہ	"	-/۲۰
شعری ادب ۷۷	"	-/۲۵
موسم	"	-/۶۰
اردو میں گلدستوں کی روایت	"	-/۲۰
ریزۂ گل	"	-/۲۰
اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ مرتبہ	"	-/۲۵
فانی بدایونی	"	-/۵۰
اکبر الہ آبادی کی شاعری	"	-/۲۰
مطالعہ مومن	"	-/۲۵
محمد حسین آزاد	"	-/۲۰
یگانہ	"	-/۸۰
اردو کی چند مشہور کتابیں ع ۱	"	-/۲۵
" " " ع ۲	"	-/۲۵
" " " ع ۳	"	-/۲۵
" " " ع ۴	"	-/۲۵
" " " ع ۵	"	-/۲۵
" " " ع ۶	"	-/۲۵
مطالعہ حالی	"	-/۷۵
ولی دکنی شخصیت اور کلام	"	-/۵۰
اردو گلڈ	"	-/۳۰
غزل پس منظر پیش منظر	"	-/۱۵۰

ادبی تنقید	ہڈسن/عصمت جاوید	-/۲۰
وجدان	"	-/۲۵
نئے تناظر	وزیر آغا	-/۱۵
آدھی صدی کے بعد	"	-/۲۵
ریت پر گرفت	رشید امجد	-/۲۰
سہ پہر کی خزاں	"	-/۲۵
فسادِ آزاد ایک تنقیدی جائزہ	تبسم کاشمیری	-/۲۰
افسانہ حقیقت سے علامت تک	سلیم اختر	-/۵۰
اعتبارِ نغمہ	ناصر کاظمی	-/۱۵
اے دل تو ہی بتا	مجید امجد	-/۱۵
حالی مقدمہ اور ہم	وارث علوی	-/۲۵
اردو افسانہ میں دیہات کی پیش کش	انور سدید	-/۴۰
میر انیس کی اقلیم سخن	"	-/۱۵
افسانے کا منظر نامہ	مرزا حامد بیگ	-/۴۰
تنقیدی افکار	شمس الرحمٰن فاروقی	-/۶۰
ریت ریت لفظ	حمید سہروردی	-/۱۵
روہی	جمیلہ ہاشمی	-/۲۰
رگے کے نوحے	ہادی حسین	-/۲۵
آنکھیں اور پاؤں	بلراج کومل	-/۴۰
ناصر کاظمی کی شاعری	حامدی کشمیری	-/۲۰
آنگن۔ ایک تنقیدی جائزہ	اسلم آزاد	-/۱۰
وہ فقیر اور	بمل کرشن اشک	-/۲۰
حیات بیدل	امانت	-/۲۰
حرف شوق	شارق میرٹھی	-/۱۰
انشا کے حریف و حلیف	عابد پیشاوری	-/۱۰۰

اشاعتی سلسلے

محمد حسین آزاد	ساحل احمد	۶/-	تیکنیک کا تنوع	ممتاز شیریں	۱۰/-
غالب کی ہندوستانیت	"	۶/-	مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر	"	۶/-
خضر راہ ایک تنقیدی جائزہ	"	۶/-	اقبال کی شعری لسانیات	امجد اسلام امجد	۵/-
گاندھیائی تحریک اور نہرو	"	۶/-	غالب کی جمالیات	سید علی عباس جلالپوری	۱۵/-
میر حسن کی غزل گوئی	"	۲۵/-	مرزا غالب اور نظریہ وحدت الوجود	"	۲۵/-
نئی غزل میں فساد و شر کے اثرات	"	۴۰/-	بجنوری بہ حیثیت ناقد غالب	شمس بدایونی	۵/-
جو کچھ لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں	"	۱۰/-	مرزا داغ دہلوی کی شاعری	سید محمد فاروق	۱۵/-
لایعلمون	"	۱۵/	غالب اور اس کی شاعری	احمد الدین احمد	۱۰/-
روشنی لہو لہو	"	۲۵/-	بال جبریل ایک مطالعہ	اثر لکھنوی	۱۰/-
دھوپ کچھ کم تھی	"	۲۵/-	اقبال کی غزلیں	ساحل احمد	۵۰/-
شاہ بیت	"	۳/-	فسانۂ آزاد اور باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ	"	۶/-
ایک تحریر	"	۳/-	تین کتابیں تنقید کی	"	۱۰/-
غزل کیا کچھ...	"	۳/-	اردو ناولوں کا مطالعہ	"	۲۰/-
ترقی پسند اردو شاعری	اشفاق حسین	۱۰/-	اردو نظموں کا مطالعہ	"	۲۵/-
فیض کی شاعری	در شہوار ابراہیم	۱۵/-	نظم نامہ	"	۲۰/-
شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی	عبادت بریلوی	۱۰/-	اردو نظم اور اس کی قسمیں	"	۲۵/-

RDU NAZMON KA MUTALEA

ahil Ahmad

Year : 1997—Rs. 20/-

لکچر سیریز

محمد حسین آزاد	ساحل احمد	۶/-
غالب کی ہندوستانیت	″	۶/-
خضرِ راہ ایک تنقیدی مطالعہ	″	۶/-
گاندھیائی تحریک اور نہرو	″	۶/-
نئی غزل میں فسادو شر کے اثرات	″	۶/-
پریم چند کی افسانہ نگاری	″	۶/-
نئی غزل ۶۰ء کے بعد	″	۱۰/-
فسانۂ آزاد اور باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ	″	۶/-
تین کتابیں تنقید کی	″	۶/-
اردو نظموں کا مطالعہ	″	۱۰/-
اردو افسانوں کا مطالعہ	″	۱۰/-
اردو ناولوں کا مطالعہ	″	۱۰/-
اردو زبان و ادب کا مطالعہ	″	۶/-
اردو خطوط نگاری کا مطالعہ	″	۱۰/-
لوازماتِ غزل	″	۱۰/-
شاہ بیت	ساحل احمد	۳/-
ایک تحریر	″	۳/-
غزل کیا کچھ....		/-
ترقی پسند اردو شاعر	اشفاق حسین	۱۰/-
فیض کی شاعری	ڈا ہواد ابراہیم	۱۵/-
شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی	عبادت بریلوی	۱۰/-
تکنیک کا تنوع ناول اور افسانے میں	ممتاز شیریں	۱۰/-
مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر	″	/-
اقبال کی شعری لسانیات	امجد اسلام امجد	۵/-
مرزا غالب اور نظریۂ وحدت الوجود	سید علی عباس جلالپوری	۲۵/-
غالب کی جمالیات	″	۱۵/-
بجنوری بہ حیثیت ناقد غالب	ڈاکٹر شمس بدایونی	۵/-

Literary Book Centre • 126, Chak, Allahabad-3

U

Sa